ہفت روزہ

صحافت

(۲۵)

اپنے بارے میں
بھٹو کے غیر معمولی
انکشافات

ملاقاتی ، وکلاء ، جیل کا نچلا عملہ ، ڈاکٹر ، ڈسپنسر ، مشقتی ، خاکروب ، حجام ، پہریدار اور وہ سارے لوگ جو ڈیڑھ برس کی قید کے دوران سابق وزیر اعظم سے کسی بھی حیثیت میں ملے ، انہوں نے بھٹو سے کیا کچھ سُنا ، ملکی اور غیر ملکی مسائل ، افراد ، شخصیتوں ، اپنی پارٹی ، حزبِ مخالف کے لیڈروں اور ذاتی زندگی کے بارے میں ایسی حیران کن معلومات جو نہ پہلے کبھی شائع ہوئیں اور نہ آئندہ ہوں گی۔

ایڈیٹر
ضیا شاہد

قیمت
تین روپے

سادگی میں آپ کی
اور آپ کے وطن کی خوشحالی ہے

قومی بچت

NATIONAL SAVINGS

اپنے قریبی قومی بچت کے مرکز ڈاک خانہ یا بینک سے رابطہ قائم کیجئے

RIO (K) PID-CDNS 415/79

سچ بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ
اور اگر تمہیں سچائی کا علم ہو تو اسکو جان بوجھ
کر اپنے تک نہ روکے رکھو۔ (قرآن حکیم)

صحافت

ایڈیٹر
ضیا شاھد

اسسٹنٹ ایڈیٹر (کراچی)
الیاس شاکر

اسسٹنٹ ایڈیٹر (لاھور)
سلیم چوہدری

اسسٹنٹ ایڈیٹر (راولپنڈی)
مشتاق اعوان

جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۲۵
تاریخ ۳، مئی ۱۹۷۹ء

پرنٹر پبلشر: ضیا شاہد
مطبع :- مزمل پرنٹرز۔ ۹ سرکلر روڈ، لاہور

قیمت ۲/ روپے

لاھور دفتر
انچارج: محمد اکرام۔ فون ۲۱۶۰۷۸
۳۸، ملتان روڈ ——— لاہور

کراچی دفتر
انچارج: محمد شبیر فون ۲۲۳۹۲۸
۲۹ ڈی نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی

راولپنڈی دفتر
انچارج: حبیب الوہاب الخیری فون ۶۳۳۵۹
۵۲۔ بی سٹیلائٹ ٹاؤن ——— راولپنڈی

فیصل آباد دفتر
انچارج: میاں محبوب جاوید فون ۳۱۲۸۸
رحمن بلڈنگ کچہری بازار ——— فیصل آباد

آغاز

پاکستان کی سبھی سیاسی جماعتیں، جمہوریت کی دعویدار ہیں اور عوام کو اختیارات منتقل کرنے کے نظریے کی ہمیشہ سے حامی رہی ہیں، لیکن گزشتہ دنوں صدر ضیاء الحق کی حکومت نے بلدیاتی انتخابات کے لئے اگست کی تاریخ مقرر کی تو ہر طرف سے مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ اس سے جمہوریت کی منزل دور ہو جائے گی۔ یہ بات اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہوں تو سیاسی جماعتیں خوش ہوں اور تالیاں بجا بجا کر انتخابات کا خیر مقدم کریں، لیکن گاؤں، قصبے اور شہر کے لوگ اپنے مقامی مسائل کے لیے افسر شاہی کے بجائے، اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنا چاہیں تو تمام سیاسی جماعتوں کے نزدیک یہ غیر جمہوری قدم قرار پائے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان سے اب تک بالغ رائے دہی کی بنیاد پر بلدیاتی انتخابات نہ ہونے کے باعث تمام تر اختیارات افسروں کے ہاتھ میں رہے ہیں یا پھر وہ لوگ جنہیں صوبائی یا قومی اسمبلی میں قانون سازی کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ قانون سازی کے بجائے گلیوں، محلوں کے معاملات، نارمل سکولوں کے داخلے، صحت وصفائی کے بندوبست میں الجھ کر رہ گئے جو نہ تو ان کا کام تھا اور نہ اس کے لئے کوئی باقاعدہ طریق کار موجود تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سفارش اور رشوت کا ایک بازار گرم ہو گیا اور ارکان صوبائی و قومی اسمبلی اپنے فرائض ادا کرنے کے بجائے تھانیدار اور تحصیلدار بن گئے اور اصل تھانیداروں اور تحصیلداروں کے روزمرہ معاملات میں اس طرح مداخلت شروع ہو گئی کہ انہیں بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ ایک ناجائز کام رکن اسمبلی صاحب کا کرو اور دس ناجائز اپنے کروا لو۔

یہی وجہ ہے کہ حکومتیں آئیں اور گئیں، مگر عوام کے مقامی مسائل حل ہونے کی شکل نظر نہ آئی اور اب جبکہ حکومت بلدیاتی اداروں کے انتخاب کے بعد حقیقی معنوں میں انتقالِ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو کرنا چاہتی ہے تو عوام کے حقوق کی علمبردار جماعتیں ہی اس کی مخالفت کر رہی ہیں۔

آیئے جماعتوں کو دیکھیں، پیپلز پارٹی جو تمام طاقت عوام کے لیے ہے کا نعرہ لگاتی تھی، اس کی مخالف ہے۔ جناب اصغر خان جو گزشتہ دنوں بات بات پر پنچائتوں اور منتخب بلدیاتی اداروں کا تذکرہ کرتے تھے اور ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کو ہٹا کر منتخب نمائندوں کو ان کی جگہ لانے کے دعویدار تھے، بلدیاتی انتخابات کے مخالف ہیں۔ قومی اتحاد کی جماعتیں جو زبان سے جمہوریت کا نام لیتے نہیں تھکتی تھیں، سب کی سب مخالف ہیں۔ این ڈی پی اور جمعیت علماء اسلام کا کہنا ہے کہ بلدیاتی انتخابات پہلے نہیں بعد میں ہونے چاہئیں۔ جناب رائے کی مساوات پارٹی بھی جس کا نعرہ لوک راج تھا اور جو نچلی سطح پر منتخب نمائندوں کو اختیارات منتقل کرنے کے نظریے کی دعویدار تھی، آج یہ کہہ رہی ہے کہ چونکہ سیاسی جماعتیں نہیں چاہتیں لہٰذا بلدیاتی انتخابات عام انتخابات کے بعد ہی ہونے چاہئیں۔

یہ عجیب تضاد ہے۔ ساری سیاسی جماعتیں صوبائی اور قومی حکومتیں بنا کر اپنا اختیار تو چاہتی ہیں، لیکن نچلی سطح پر عوام کے منتخب نمائندوں کو اختیارات کی منتقلی پسند نہیں کرتیں۔

پہلے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے عام انتخابات مشکوک ہو جائیں گے۔ حکومت نے پرزور الفاظ میں کہا کہ اسمبلیوں کے لیے انتخابات لازماً ۱۷ نومبر کو ہوں گے۔ پھر کہا گیا کہ بنیادی جمہوریت کا نظام پہلے بھی ناکام ہو چکا ہے۔ توجیہہ دی گئی کہ یہ بنیادی جمہوریت کا نظام نہیں، کیونکہ بلدیاتی اداروں کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے اسمبلیوں کے نمائندوں کے لیے ووٹر نہیں، بلکہ اسمبلیوں کے انتخابات براہِ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہو رہے ہیں۔ اب کوئی منطق نہیں بتائی جاتی۔ ہر سیاسی جماعت کوئی وجہ بتائے بغیر دھڑا دھڑ بلدیاتی انتخابات کے انعقاد کی مخالفت کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے کہ ہم بعد میں انہیں کرائیں گے۔

اس کی وجہ گھر کے بھیدی بتاتے ہیں کہ تمام سیاسی چودھریوں کا خیال ہے کہ بلدیاتی انتخابات ہو گئے اور عوام کو ان کے روزمرہ کاموں کے لیے اختیار مل گیا تو انہیں کون پوچھے گا، ان پر کون روپیہ خرچ کریگا، ہر علاقے کا سرکردہ خود ممبر بن گیا تو انہیں سیاسی چمچے کہاں سے ملیں گے۔ اور اگر عوام کو اپنے معاملات حل کرنے کا نظام میسر آ گیا تو ان کی چودھراہٹ اور ایم پی اے اور ایم این اے حضرات کی تھانیداری کیسے سلامت رہے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسمبلیاں بناؤ اور بلدیاتی اداروں کا مسئلہ کھٹائی میں ڈالو۔

عوام دوستی، کا دعویٰ کرنے والی اور عمر بھر جمہوریت کا نام لینے والی جماعتیں، عوام کو جمہوری حقوق دینے کے لیے ایک نظام کے محض اعلان پر جس طرح اپنی عوام دشمنی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اس پر انہیں مبارکباد دینی چاہیئے۔

نئی خبریں پڑھ لیجیے

صحافت رپورٹ

یحییٰ بختیار فارمولا

مرحوم مسٹر بھٹو کے بڑے وکیل، بلوچستان پیپلز پارٹی کے سربراہ اور پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار گزشتہ دنوں خاموشی سے لاہور آئے اور انہوں نے ایک ہفتہ یہاں خفیہ ملاقاتوں میں گذارا۔ وہ کوٹ لکھپت جیل میں پیپلز پارٹی کے ڈپٹی لیڈر شیخ محمد رشید اور سابق سیکرٹری جنرل فاروق لغاری سے بھی ملے اور پیپلز پارٹی کے کئی دیگر مقتدر عہدیداروں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ بعد ازاں انہوں نے سہالہ ریسٹ ہاؤس جاکر بے نظیر بھٹو سے تفصیلی بات چیت کی، حالانکہ آج کل وہ بے نظیر یا بیگم نصرت بھٹو کے کسی مقدمے میں وکیل نہیں ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ یحییٰ بختیار کی ان ملاقاتوں کا مقصد موجودہ حکومت سے پیپلز پارٹی کی کنفرنٹیشن کو ختم کرانا ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ حکومت بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو رہا کر دے اور دونوں خواتین کچھ عرصے کے لئے پاکستان سے باہر چلی جائیں تاکہ کسی قسم کی محاذ آرائی کا خطرہ پیدا نہ ہو اور جب پارٹی کارکنوں اور مسٹر بھٹو کے حامیوں کا غم و غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو واپس آکر انتخابات میں حصہ لیں۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی کے معتدل مزاج حلقے اس تجویز کی حمایت کر رہے ہیں اور یحییٰ بختیار فارمولے کو ملک، پیپلز پارٹی اور حکومت تینوں کے لئے فائدہ مند سمجھتے ہیں لیکن انتہا پسند حلقے یحییٰ بختیار کی ذات ہی کو ناقابل اعتماد قرار دے کر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اندرون خانہ حکومت سے مل گئے تھے اور مسٹر بھٹو کو پھانسی دلوانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔

مرتضیٰ بھٹو کا تار

بادثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو نے جو آج کل لندن میں ہیں، ڈی آئی جی راولپنڈی کے نام ایک تار بھیجا ہے جس میں ان سے مسٹر بھٹو کی موت کو غیر قانونی قتل قرار دیتے ہوئے درخواست کی گئی ہے کہ متعلقہ افراد پر ۳۰۲ کا مقدمہ چلایا جائے۔ واضح رہے کہ مسٹر بھٹو کی سزائے موت پاکستان کی سب سے بڑی عدالت نے برقرار رکھی تھی اور انہیں قانون کے ضابطوں کے مطابق سزا دی گئی۔ اس تار کے مضمون کو سرکاری حلقوں ہی میں نہیں بلکہ خود پیپلز پارٹی کے اندرونی حلقوں میں بھی مضحکہ خیز سمجھا گیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے ایک سابق مرکزی وزیر اور مرکزی عہدیدار نے جو لاہور میں رہتے ہیں اس تار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے لیڈر کے اہل خانہ کی نئی نسل نے بھی اتنے بڑے المیے سے سبق نہیں سیکھا اور بے کار اور بے مقصد سنسنی خیزی پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں جبکہ اب ضرورت زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ہے کہ اس دلدل میں سے معاملے کو کیسے نکالا جائے جس میں یہ پھنس چکا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو کا پیغام

معلوم ہوا ہے کہ سہالہ کیمپ سے بیگم نصرت بھٹو نے اپنے وکلا کی زبانی یہ پیغام بھیجا ہے کہ ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی دیرینہ دشمنی اور تنازعے کو ختم کرایا جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ مل کر کام کریں۔ بیگم صاحبہ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ بائیں بازو کے انتہا پسندوں کو پارٹی پر قابض نہ ہونے دیا جائے اور دائیں اور بائیں بازو کے مابین جس توازن کو مسٹر بھٹو بڑی مہارت سے برقرار رکھتے تھے، اسے جوں کا توں رکھا جائے۔ بیگم صاحبہ کے ملاقاتیوں کا کہنا ہے کہ وہ بار بار کارکنوں کو پر امن رہنے اور انتظار کرنے کا کہہ رہی ہیں اور محاذ آرائی کی پالیسی سے یکسر گریز چاہتی ہیں۔

راجہ منور احمد کی آمد

مسلم لیگ کے دونوں بڑے دھڑوں کے مابین صلح کروانے کے لئے حال ہی میں چوہدری ظہور الٰہی نے پیر صاحب پگاڑو سے جو طویل ملاقات کی، وہ ایم۔ کے خاکوانی کے گھر ہوئی اور اس کا بندوبست پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کے سیاسی مشیر اور نوجوان سیاستدان راجہ منور احمد نے کروایا تھا۔ راجہ منور بعض بنیادی اور اصولی اختلافات کے باعث پاکستان مساوات پارٹی چھوڑ چکے ہیں اور مشکل ترین "سیاسی مہمات" سر کرنے کا انہیں ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ یاد رہے کہ مصطفےٰ کھر کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے الگ کروانے کے لئے انہوں نے مہم شروع کی تھی، بعد میں پنجاب ہی میں دو سیاسی حریفوں رامے اور کھر کا سیاسی اتحاد بھی انہوں نے ہی کروایا تھا، چوہدری ظہور الٰہی اور حنیف رامے کے مذاکرات کروانے کے بعد رامے کو مسلم لیگ میں لانے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ مسلم لیگ میں رہ کر ۷۷ء کے انتخابات کے لئے ایک منشور، ایک پرچم اور ایک انتخابی نشان کے تحت مسٹر بھٹو کا مقابلہ کرنے کے لئے قومی اتحاد بنانے کا خاکہ سب سے پہلے انہوں نے مسلم لیگ اور جمہوری محاذ کو دیا جس میں اس اتحاد کا نام نیشنل کانفرنس تجویز کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ، تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کا ابتدائی اتحاد کروانے کی کوششیں بھی انہی کے ایما پر شروع ہوئیں اور وہ ان مذاکرات میں شرکت کے لئے کراچی جا رہے تھے کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور رامے و خاکوانی کے ساتھ شاہی قلعہ میں تشدد کے لئے لے جایا گیا، بعد میں وہ سال بھر کوٹ لکھپت جیل میں قید رہے اور جس کمرے میں ان کا قیام تھا، وہی کمرہ مسٹر بھٹو کے حصے میں آیا۔

راجہ منور پنجاب کے ذہین ترین سیاستدانوں میں شمار ہوتے ہیں اور عام طور پر انہیں کم ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ درست تجزیہ اور غیر جانبدار سوچ کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ فرد کے بجائے ادارے کی تشکیل پر زور دیتے رہے ہیں۔ ایک مقتدر اخبار نویس نے جب یہ سنا کہ وہ بھی مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے مابین ملاقاتیں کروا رہے ہیں تو فوراً پیشگوئی کر دی کہ اب صلحنامہ ہو جائے گا۔

ایک سال سے زیادہ قید تنہائی میں اپنے اکا دکا "ملاقاتیوں" سے سابق وزیرِاعظم کی بات چیت

ملاقاتی، وکلاء، جیل کا نچلا عملہ، ڈاکٹر، ڈسپنسر، مشقتی، خاکروب، حجام، پہریدار اور وہ سارے لوگ جو ڈیڑھ برس کی قید کے دوران سابق وزیرِاعظم سے کسی بھی حیثیت میں ملے، انہوں نے بھٹو سے کیا کچھ سُنا۔ ملکی اور غیر ملکی مسائل، افراد، شخصیتوں، اپنی پارٹی، حزبِ مخالف کے لیڈروں اور ذاتی زندگی کے بارے میں ایسی حیران کن معلومات جو نہ پہلے کبھی شائع ہوئیں اور نہ آئندہ ہوں گی۔

اپنے بارے میں بھٹو کے غیر معمولی

انکشافات

غلام حسین

مسٹر بھٹو زندگی میں پہلی بار نومبر ۶۸ء میں گرفتار ہوئے تھے۔ ایوب خان اس دور میں صدرِ مملکت تھے۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر واقع مین روڈ گلبرگ سے عمل میں لائی گئی تھی اور انہیں میانوالی جیل میں رکھا گیا تھا۔ بعد ازاں ساہیوال منتقل کیا گیا، مگر جب لاہور ہائیکورٹ میں ان کی طرف سے بیگم نصرت بھٹو نے رٹ درخواست دائر کی جس کے وکیل محمود علی قصوری اور حفیظ پیرزادہ تھے، تو جسٹس مولوی مشتاق حسین نے حکم دیا کہ انہیں لاہور منتقل کیا جائے۔ اس پر حکومت پنجاب نے مسٹر بھٹو کو ساہیوال جیل سے بورسٹل جیل لاہور میں منتقل کر دیا۔ یاد رہے کہ بورسٹل جیل اس مقام پر واقع تھی جسے آج کل کیمپ جیل لاہور کہا جاتا ہے اور جو فیروز پور روڈ پر اومنی بس کے ڈپو کے سامنے ہے۔ اس مقدمے کی کارروائی بورسٹل جیل کی حدود ہی میں سنی گئی تھی۔

ساہیوال جیل میں مسٹر بھٹو جس وارڈ میں تھے، وہاں صادق نامی ایک وارڈر نے ان کی بہت خدمت کی۔ مسٹر بھٹو خاص طور پر وہاں مشروبات وغیرہ کی کمی محسوس کرتے تھے اور یہ وارڈر انہیں روح افزا کی بوتلوں میں ان کے پسندیدہ مشروب پہنچایا کرتا تھا۔ بعد میں جب مسٹر بھٹو اقتدار میں آئے تو صادق لاہور جیل میں ملازم تھا۔ اسے مسٹر بھٹو نے بلا کر ان خدمات کے عوض ایک مربع زمین عطا کی اور کچھ نقد امداد کے علاوہ اس کی بچی کو ملازم کروایا۔ اس مناسبت سے جیل کے عملے اور قیدیوں میں صادق کا نام صادق بھٹو پڑ گیا تھا۔ وہ آج بھی محکمہ جیل میں ملازم ہے اور مسٹر بھٹو کے واقعات مزے لے کر سناتا ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صادق بھٹو کو بخشش کے طور پر سابق صدر بھٹو کی طرف سے دی جانے والی زمین کا قبضہ ابھی تک نہیں ملا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صادق بھٹو نے تو چند ماہ کے لیے مسٹر بھٹو کی خدمت کی تھی، لیکن ان کے خادمِ خاص نور محمد مغل نے اپنی ساری زندگی بھٹو خاندان کی خدمت کرتے گزاری تھی اور جس زمین کا قبضہ صادق کو نہ ملا، اس کی وجہ نور محمد مغل کے بعض واقف کاروں کا رویّہ بھی تھا جو اس زمین پر قابض تھے۔ بورسٹل جیل لاہور میں ان دنوں شیخ احسان غنی سپرنٹنڈنٹ تھے اور قاضی اسلم کے نام کے اسسٹنٹ میڈیکل افسر تھے جو پونا سے اپنا کورس مکمل کر کے آئے تھے۔ شیخ احسان غنی آج کل ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیلخانہ جات ہیں اور قاضی اسلم

کوٹ لکھپت جیل میں اسی عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ ایوب خان کے اٹارنی جنرل ان دنوں سید شریف الدین پیرزادہ تھے جو آج کل بھی اٹارنی جنرل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایوب خاں مرحوم نے لاہور جیل کے حکام سے بطور خاص کہا تھا کہ انہیں خبر ملی ہے کہ مسٹر بھٹو کی صحت ٹھیک نہیں رہتی، لہٰذا انہیں ان کے پسندیدہ مشروبات منگوانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ شریف الدین پیرزادہ سے مشورے کے بعد جیل حکام نے مسٹر بھٹو کے سامان کی چیکنگ ختم کر دی تھی۔ ان دنوں مسٹر بھٹو جیل میں بھی پاکستانی پانی نہیں پیتے تھے، بلکہ فرانس سے ڈسٹلڈ واٹر کی سفید رنگ کی بوتلیں جیل میں آتی تھیں جن میں بعد ازاں سفید جن اور دیگر اقسام کی بوتلیں بھی رکھدی جاتیں۔ اس وقت کے جیل کے عملے کا کہنا ہے کہ انہیں خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ اس بات سے صرف نظر کریں اور خاص مشروبات اندر جانے دیں۔

بعد ازاں مسٹر بھٹو کو رہا کر دیا گیا تھا۔ یہ رہائی حکومت نے اپنے حکم سے کی تھی۔ اگرچہ عدالت سے بھی رہائی کی توقع تھی۔ یاد رہے کہ جسٹس مولوی مشتاق نے مسٹر بھٹو کے مقدمے کی سماعت کی تھی اور ان کے رویے اور انصاف پسندی کی بہت دھوم مچی تھی۔ اس مقدمے کی سماعت کے دوران ایک بار سرکاری وکیل نے مسٹر بھٹو کی بیگم کے بارے میں اپنی جرح کے دوران میں کوئی نازیبا لفظ استعمال کیا تو جسٹس مولوی مشتاق حسین نے سختی سے ڈانٹا تھا۔

قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ دس سال بعد ۱۹۷۸ء میں لاہور ہائی کورٹ ہی نے مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کی سماعت کی اور جسٹس مولوی مشتاق حسین اس بنچ کے سربراہ اور لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے اور انہوں نے ہی مسٹر بھٹو کو قتل کا مجرم قرار دے کر سزائے موت دی۔

زندگی میں مسٹر بھٹو کی دوسری گرفتاری ان کی وزارت اعظمیٰ سے علیحدگی کے بعد ۳، ستمبر ۱۹۷۷ء کو ۷۰ کلفٹن کراچی کی قیام گاہ سے ہوئی اور انہیں ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور پہنچایا گیا۔

انہیں لاہور چھاؤنی کے ایک بنگلے میں رکھا گیا، ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق نے تفتیش کی، بعد ازاں انہیں کوٹ لکھپت جیل میں منتقل کر دیا گیا، لیکن کچھ دن جیل میں رہنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس صمدانی نے ان کی ضمانت منظور کر لی اور مسٹر بھٹو رہا ہو گئے۔

عیدالفطر کے دوسرے روز یعنی ۱۷ ستمبر کو انہیں دوبارہ مارشل لاء کے حکم ۱۲ کے تحت لاڑکانہ سے گرفتار کیا اور سکھر اور کراچی کے راستے لاہور پہنچایا گیا۔ اسی دوران مقدمہ قتل میں ان کی ضمانت بھی ہائی کورٹ کے فل بنچ نے منسوخ کر دی۔ گویا اب مسٹر بھٹو قتل کے ملزم کی حیثیت کوٹ لکھپت جیل لاہور میں تھے۔ اسی حیثیت میں انہوں نے ایک سال دو ماہ کا عرصہ گزارا اور ان کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ کے سامنے پیش رہا۔

کوٹ لکھپت جیل میں سپرنٹنڈنٹ کا نام حمید اصغر ہے جو اپنے سخت ڈسپلن کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سید رفیق حسین شاہ ہیں۔ ڈاکٹر کا نام فاروقی تھا جو اسی دوران فوت ہو گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر تجمل نے لی۔ اسسٹنٹ میڈیکل افسر اسلم قاضی ہیں۔

شروع میں مسٹر بھٹو کو جو مشقتی دیا گیا اس کا نام اعجاز تھا۔ وہ سابقہ فوجی ہے اور ساہیوال کا رہنے والا ہے۔ ہائی کورٹ سے مسٹر بھٹو کو سزائے موت سنائے جانے سے کچھ عرصہ بعد اعجاز رہا ہو گیا اور اس کی جگہ محمد بشیر ولد سخی محمد نامی مشقتی نے لی۔ جو ابھی تک کوٹ لکھپت جیل میں ہے۔

کوٹ لکھپت جیل میں قید کے دوران میں عام ملاقاتی بیگم نصرت بھٹو، اور بے نظیر بھٹو کے علاوہ وکلائے صفائی یحییٰ بختیار، ڈی ایم اعوان اور غلام علی میمن مرحوم وغیرہ تھے۔ شروع میں کھانا صادق حسین قریشی اور فاروق لغاری کے ہاں سے آیا۔ بعد میں بیگم نصرت بھٹو نے ۳۱ جی گلبرگ لاہور میں جو کوٹھی کرائے پر لی تھی اور جہاں وہ رہائش پذیر تھیں، وہاں سے آنے لگا۔ کھانا دن میں ایک بار آتا۔ جیل کی ڈیوڑھی میں اس کی چیکنگ کی جاتی تھی۔ اس بار حکام نے سختی سے اس امر کا اہتمام کیا کہ کسی قسم کا نشہ آور مشروب اندر نہ لیجایا جا سکے اور بعض لوگوں کو اس امر پر حیرت ہوتی تھی کہ مسٹر بھٹو جن کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ نشہ آور مشروبات کے بغیر نہیں رہ سکتے، ایک سال سے زیادہ عرصہ تک کیسے گزر بسر کرتے رہے۔ یہ بات مسٹر بھٹو کی غیر معمولی قوتِ ارادی کی مظہر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ لاہور اور راولپنڈی کی جیلوں میں مسٹر بھٹو نے ایک قطرہ نشہ آور مشروب نہیں چکھا۔

ستمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ مسٹر بھٹو قتل کے مقدمے میں ملزم کے طور پر کوٹ لکھپت جیل میں لائے گئے۔ وہ سفید کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے اور ان کے ہاتھوں میں سفید ہی رومال تھا۔ انہیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بٹھایا گیا اور ضابطے کی کارروائیاں مکمل کی جانے لگیں۔ اس دوران میں اوپر جن ملازمین کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر پر جو ایوب خان کے دور میں مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے وقت بورسٹل جیل میں رہا تھا، مسٹر بھٹو کی نظر پڑی۔ مسٹر بھٹو نے چند سیکنڈ تک اپنے حافظے پر زور دیا اور پھر اس کے سلام کرنے پر یہ کہا: ”کیا تمہارا نام قاضی ہے؟“

افسر نے جواب دیا: ”جی ہاں“

مسٹر بھٹو بولے: ”تعجب ہے کہ میں اتنا عرصہ حکومت میں رہا، تم مجھ سے ملنے نہیں آئے، حالانکہ تم نے میری بہت خدمت کی تھی۔“

اسسٹنٹ میڈیکل افسر مسٹر قاضی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ”جناب میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ میں آپ کے پاس کیا لینے آتا۔“

مسٹر بھٹو بولے: ”میرے پاس جو آیا میں نے اسے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا۔ تم آتے تو میں ضرور تمہیں نوازتا۔“

اسسٹنٹ میڈیکل افسر قاضی اسلم جو اس جیل میں واحد افسر

تھے جو مسٹر بھٹو کی دیکھ بھال ایوب خان کے دور میں بھی کر چکے تھے اور جو پنجابی کے ایک شاعر بھی ہیں، نے مسٹر بھٹو کا شکریہ ادا کیا اور کہا "جناب ہمارے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں اور ہم اپنے فرائض کے مطابق ان کی خدمت کرتے ہیں، لیکن کسی صلے کی خاطر نہیں۔ اب تو آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب آپ اقتدار میں تھے تو میرے اور آپ کے مابین بہت فاصلہ تھا جسے عبور کرنا نہ تو آسان تھا اور نہ مجھ ایسے درویش مزاج انسان کے پاس اس کے لیے حوصلہ تھا"

مسٹر بھٹو کو ان کے سیل میں پہنچا دیا گیا۔ جیل قوانین کے مطابق ان کا قیدی نمبر ۱۷۷۲ تھا۔ جو کوائف جیل رجسٹر میں درج کیے گئے حسب ذیل تھے:

نام ذوالفقار علی بھٹو، قد پانچ فٹ ۱۰ انچ، وزن ۱۷۵ پونڈ، ایک نشان ماتھے کے بائیں طرف، حوالاتی زیر دفعہ ۳۰۲، ۳۰۷، ت پ، ۱۲/۱۶ ۱۰۹ ت پ تھانہ اچھرہ، حوالاتی ہمراہ بش شرٹ و پتلون ایک عدد ولدیت، شاہنواز بھٹو، سکنہ نوڈیرو، پیشہ سیاسی لیڈر،

مسٹر بھٹو کو سیکورٹی وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ انہیں اعجاز نامی مشقتی دیا گیا جو سابق فوجی تھا۔ ہسپتال میں استعمال ہونے والا سفید آہنی پلنگ، لکڑی کا میز، دو کرسیاں، ایک ٹیبل لیمپ، غسل خانے میں بالٹی اور مگ، باورچی خانے میں لکڑی اور کوئلہ یہ سابق وزیر اعظم کی کل کائنات تھی۔

مسٹر بھٹو کے کمرے کے ساتھ جو چھوٹا سا صحن موجود تھا، اس میں گھاس کا پلاٹ، آم کے دو درخت، نیم کے دو درخت اور پھولوں کی پانچ عدد کیاریاں موجود تھیں، البتہ اکثر پھول بے خوشبو تھے۔

اگر مسٹر بھٹو صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک چکر مکمل کرتے تو ایک ہزار گز کا فاصلہ بنتا اور اگر وہ صبح کی ورزش کے لیے اٹھارہ چکر لگاتے تو ایک میل کی سیر مکمل کر سکتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسٹر بھٹو انتہائی دیر سے سونے کے عادی تھے، لہٰذا صبح سویرے نہیں اٹھ سکتے تھے، البتہ شام کے وقت بند ہونے سے پہلے وہ صحن میں تھوڑی دیر ضرور ٹہلتے۔

شروع میں مشقتی اعجاز الگ سوتا تھا۔ بعد میں اُسے ساتھ ہی سونے کی اجازت دی گئی، کیونکہ مسٹر بھٹو کو رات میں کئی بار تیز کافی پینے کی عادت تھی اور مشقتی کے سر شام جانے کے باعث مسٹر بھٹو کو خود کافی بنانا پڑتی تھی۔

مسٹر بھٹو جس پلنگ پر لیٹتے تھے وہاں قریب ہی کھڑکی تھی جس کے اندرونی پٹ نہیں تھے۔ سلاخوں اور جالیوں میں سے انہیں ہر وقت دو مناظر دکھائی دیتے: کھڑکی کے بالائی حصے سے جیل کے بیرونی دروازے پر لگا ہوا پاکستان کا سبز پرچم اور کھڑکی کے وسطی حصے سے ساتھ والے احاطے میں "پھانسی گھر" کا لٹکتا ہوا وہ رسہ جو مجرم کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ پاکستانی پرچم سے پھانسی کے پھندے تک یہ منظر ہر وقت سابق وزیر اعظم کے سامنے رہتا تھا۔

جن دنوں مسٹر بھٹو نئے نئے جیل میں آئے تھے، لاہور کے روزنامہ "سیاست" نے ایک شجرہ شائع کیا۔ جس کے مطابق مسٹر بھٹو کا نام گھاسی رام تھا اور وہ ایک پیشہ ور ہندو عورت کی اولاد بتائے گئے تھے۔ اس اخبار کے حوالے سے یہ بات بہت پھیلی۔ ایک روز مسٹر بھٹو جن تک یہ اخبار پہنچایا گیا تھا، اسے پڑھ کر خود ہی بول پڑے کہ اصل قصہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے والد سر شاہنواز بھٹو نہ صرف پورے خاندان میں سرکردہ تھے، بلکہ انگریزی حکومت نے انہیں سر کا خطاب بھی دے رکھا تھا۔ اہلِ خاندان میں سے اکثر بالخصوص میرے چچا وغیرہ ان سے بہت جلتے تھے اور جب میرے والد نے والدہ سے جو ایک غریب خاندان کی عورت تھی اور جو بھٹو فیملی سے بھی تعلق نہیں رکھتی تھی اور بمبئی کی رہنے والی تھی، شادی کی تو خاندان والوں کو خواہ مخواہ اعتراض کرنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے اس قسم کی الزام تراشیاں شروع کر دیں۔ باقی تمام باتیں واہیات اور بے سروپا ہیں۔ میں اپنی والدہ کے بارے میں اپنے منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ سینکڑوں ہزاروں لوگ جنہوں نے ان کا مذہبی کردار اور مشفقانہ رویہ دیکھا، بخوبی جانتے ہیں کہ وہ نہایت دیندار اور اچھے اخلاق کی خاتون تھیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ایسی دشمنیاں ہر خاندان میں ہوتی ہیں اور جائدادوں کے معاملے میں رنجش وغیرہ آج بھی موجود ہے اور میرے خاندان کے بعض لوگ جو سر شاہنواز بھٹو کی مقبولیت برداشت نہ کر سکے تھے، آج میری شہرت اور ناموری سے بھی اندرونی طور پر حسد کرتے ہیں، لیکن میں نے ان چیزوں کی کبھی پروا نہیں کی، بلکہ جو میرے پاس آیا اُسے اُلٹا ہمیشہ نوازا ہے۔

خاندان ہی کے بارے میں ایک اور موقع پر مسٹر بھٹو نے کہا کہ اُن کی پہلی بیوی امیر بیگم سے ان کی شادی کو بھی اہلِ خاندان نے پسند نہ کیا تھا، کیونکہ ان کی وجہ سے کچھ جائداد میرے حصے میں آ گئی تھی۔ امیر بیگم کی بہن سردار نبی بخش بھٹو کی بیگم اور ممتاز بھٹو کی والدہ ہیں۔ ان لوگوں سے بھی ہمارے گھرانے سے خوشگوار مراسم نہیں رہے اور بالخصوص میری نصرت بھٹو سے شادی کے بعد تعلقات مزید خراب ہو گئے، لیکن اس کے باوجود میں نے ممتاز بھٹو کو گورنر اور وزیر بنایا تاکہ خاندان میں یہ نہ کہا جائے کہ میں پرانی دشمنی کا بدلہ لے رہا ہوں، البتہ بیگم نصرت بھٹو سے ممتاز بھٹو کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے، کیونکہ میری پہلی بیوی یعنی امیر بیگم ممتاز بھٹو کی سگی خالہ بھی ہیں۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ آجکل بھی انہیں ممتاز بھٹو کے خاندان سے بھلائی کی توقع کم ہی ہے، تاہم وہ اپنی طرف سے آخری مرحلے تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے کہ دیرینہ مخالفوں کو اعتراض کا موقع ملے۔

مسٹر بھٹو نے بتایا کہ بیگم نصرت سے ان کی شادی ایک ملاقات کا نتیجہ تھی جس میں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ مسٹر بھٹو کے بقول نصرت بہت سادہ مخلص اور وفا شعار قسم کی بیوی ثابت ہوئیں اور انہوں نے میری کئی کمزوریوں کے باوجود کبھی شکایت نہیں کی، البتہ وہ کچھ زیادہ سیاسی شعور نہیں رکھتیں اور مجھے اپنے بعد ان سے کوئی خاص امید نہیں، لیکن مجھے بے نظیر پر فخر ہے اور میں اُس میں قائدانہ صلاحیتیں دیکھتا ہوں۔ وہ یقیناً ایک دن نامور سیاستدان ہوگی اور میرے خاندان کا نام روشن کرے گی۔

جس ذریعے نے یہ روداد بیان کی اس کا کہنا ہے کہ بے نظیر کی تصویریں دیکھ کر مسٹر بھٹو کی آنکھوں میں چمک آ جاتی تھی، کئی مرتبہ تو انہوں نے بیٹی کی تصویر کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر انہوں نے ایک ملازم سے کہا دیکھو، میری بیٹی، مجھ سے کس قدر مشابہ ہے، یہاں تک کہ جلسے میں میری طرح دونوں ہاتھ اٹھا کر بات کرتی ہے۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اپنے بیٹوں کے بارے میں انہیں چنداں خوش فہمی نہ تھی۔ کئی بار تذکرہ ہونے پر وہ کہتے، وہ میرے بچے ہیں، لیکن جس کام کو میں ادھورا چھوڑ کر جا رہا ہوں اُسے پورا کرنے کی اُن میں کوئی صلاحیت نہیں۔

سادہ مزاج اور سیدھے سادے نچلے عملے کے ارکان اور خدمتگاروں میں ایک مرتبہ آخری خواہشات کا ذکر چھڑا تو پوچھا گیا کہ آپ کو بیٹی کی شادی کی فکر نہیں ہے؟ اس پر مسٹر بھٹو نے کہا کہ میں زبردستی کر کے بے نظیر کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنا برا بھلا خود سوچ سکتی ہے۔ اگر میں نے جلدی میں کوئی فیصلہ کر لیا تو یہ اس کا مستقبل تاریک کر دے گا اور وہ سوچے گی کہ جاتے جاتے میرے پاپا مجھے کس مصیبت میں پھنسا گئے۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ بے نظیر جب چاہے اور جہاں چاہے شادی کر سکتی ہے، میری طرف سے اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہے اور میں اس کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا۔

ایک دفعہ قائد اعظمؒ کا تذکرہ چھڑا تو مسٹر بھٹو نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ بمبئی میں قائد اعظم، پنڈت نہرو اور میرے والد ایک ہی سڑک پہ رہتے تھے اور ان کے گھرانوں میں باہمی میل جول موجود تھا۔ ایک دفعہ میں کرکٹ کھیلنے جا رہا تھا کہ میرے والد مجھے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ پنڈت نہرو کی کوٹھی میں لے گئے۔ ڈرائنگ روم میں حضرت قائد اعظمؒ بھی موجود تھے اور پنڈت نہرو بھی۔ والد تو ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور میں پردے کے پیچھے چھپ گیا، کیونکہ ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ قائد اعظم نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھا تو اپنے مخصوص انداز میں چھتری کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں جھجکتا ہوا ان کے قریب گیا تو انہوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتلایا۔ اس پہ نہرو بولے: یہ لڑکا بہت ذہین ہے اور مجھے امید ہے کہ ایک روز بڑا ہو کر یہ انڈیا کا وزیر اعظم ہو گا۔ میں نے فوراً کہا کہ ہمارے لیڈر قائد اعظم ہیں جن کا کہنا ہے کہ پاکستان بن کر رہے گا، اس لیے میں انڈیا کا نہیں، پاکستان کا وزیر اعظم بنوں گا۔ اس پر سب ہنس پڑے اور مجھے پیار کیا۔

مسٹر بھٹو نے بتایا کہ وہ بچپن میں نہرو کو ہمیشہ انکل کہہ کر بلاتے تھے اور پنڈت جی بھی ان سے بہت پیار کرتے تھے، دونوں گھرانوں میں ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی۔

ایک اور موقع پہ مسٹر بھٹو نے اچھے موڈ میں پنڈت نہرو کے بارے میں گفتگو شروع کر دی اور کہا کہ وہ نہایت ذہین انسان اور بہت بڑے سیاستدان تھے۔ انہوں نے کہا میں اپنی زندگی میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ اپنا ایک واقعہ سناتے ہوئے بھٹو بولے کہ جب میں ایوب خان کا وزیر خارجہ تھا تو کشمیر کے مسئلے پر مذاکرات کے لیے کئی مرتبہ بھارت گیا۔ ایک بار جب میں دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ سورن سنگھ جن سے میرے مذاکرات ہو رہے تھے، کسی طرح پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے، اس لیے کیوں نہ پنڈت جی سے براہ راست ملوں۔ میں نے ان کے عملے سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ بہت مصروف ہیں اور وقت نہیں دے سکتے۔ میں ان سے ملنے کا تہیہ کر چکا تھا، اس لیے رات کے وقت کار لے کر خود ہی ان کی رہائش گاہ پہ پہنچ گیا، لیکن عملے نے کہا کہ وزیر اعظم سٹڈی میں ہیں اور کسی سے نہیں مل سکتے۔

میں نے کہا کہ اندر یہ اطلاع بھجوائیں کہ ان کا بھتیجا ذوالفقار علی پاکستان سے ملنے آیا ہے۔ اس پر تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلایا گیا۔

پنڈت جی کتابوں میں گھرے بیٹھے تھے اور خود بھی ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں جا کر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے کتاب سے نظریں اٹھا کر میرے سلام کا جواب دیا اور پھر کتاب پڑھنے لگے۔ میں شروع میں تو پریشان ہوا کہ وہ میری طرف توجہ دینے کے لئے تیار ہی نہیں، لیکن جلد ہی خود پر قابو پایا اور طے کیا کہ ان سے بات کر کے جاؤں گا۔ چنانچہ میں مسلسل ان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کتاب ہٹا کر مجھے دیکھتے اور پھر چہرہ چھپا لیتے۔ غالباً وہ سمجھ گئے کہ میں اپنے خاندانی تعلقات کو پاک بھارت مذاکرات کے سلسلے میں استعمال کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا وہ نظریں ملانے سے گریز کر رہے تھے اور یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انہیں میری آمد کی کوئی پروا نہیں۔ میں بڑے صبر کے ساتھ منتظر رہا۔ بالآخر انہیں کتاب بند کرنا پڑی۔ میں نے کہا: "چچا، میں آپ سے ملنے آیا تھا۔" وہ ذرا سنبھلے اور پھر غیر متعلق سے ہو کر بولے: "کہو، کیا حال ہے؟"

میں نے بات شروع کی اور کہا کہ سورن سنگھ کشمیر کے معاملے میں جو رویہ اپنائے بیٹھا ہے، اس سے کبھی بات آگے نہیں بڑھے گی۔ آپ میرے والد کے دوست رہے ہیں اور میری خواہش ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مستقل امن کا دور شروع ہو، لہٰذا آپ اس بارے میں خود دلچسپی لیجئے۔

وہ خاموش رہے۔

میں نے پھر کوشش کی اور سورن سنگھ کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کشمیر کی سینکڑوں برس پرانی تاریخ سے شروع کرتا ہے اور آج کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں راجوں مہاراجوں کے قصے سن کر کیا کہوں۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس طرح بات نہیں بنے گی۔

نہرو نے ساری روداد سن کر صرف ایک بات کہی، وہ بولے:

"ذوالفقار، تم اس قضیئے کو چھوڑو، میں تمہیں بچپن سے دیکھتا رہا ہوں۔ تم ذہین اور تاریخ و سیاست سے آگاہ ہو اور میں تصور میں تمہیں انڈیا کا آئندہ وزیر اعظم دیکھ رہا ہوں۔ اس طرف توجہ دو اور باقی معاملات کو جانے دو۔"

یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے احتجاجاً کہا: "چچا میں پاکستان کا وزیر خارجہ ہوں اور اپنے ملک کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ آپ میری پوزیشن کا تو خیال کریں"

اس پر نہرو بولے: "بھتیجے، اگر تم وزیر خارجہ کی حیثیت سے بات کر رہے ہو تو سورن سنگھ سے مذاکرات میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرو۔ یہاں تم چچا کے گھر آئے ہو جو تمہیں ٹھیک اور صحیح مشورہ دے رہا ہے اور تمہارے مستقبل کو روشن دیکھنا چاہتا ہے"

مسٹر بھٹو نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اب مزید کسی بات کی گنجائش نہ تھی، میں اپنی ذات کے لئے ملک کا سودا کیسے کر سکتا تھا، لہٰذا چند رسمی باتوں کے بعد اجازت لے کر چلا آیا۔

پنڈت نہرو کے بارے میں مسٹر بھٹو کی رائے بہرحال ہمیشہ ایک عظیم سیاسی مدبر کی رہی اور جیل میں بھی وہ نہرو کی تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے۔

پنڈت نہرو کے علاوہ جن سیاسی شخصیتوں کا بھٹو تذکرہ کرتے تھے، ان میں نپولین، ہٹلر، ماوزے تنگ اور چو این لائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکثر شخصیات کے بارے میں کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ کوٹ لکھپت جیل میں قید کے دوران بھٹو بے تحاشا لکھتے تھے۔ وکلا ان کے لئے مقدمے کی سابقہ کارروائی، گواہوں کے بیانات اور مختلف کاغذوں کی نقول فراہم کر جاتے تھے اور مسٹر بھٹو رات رات بھر ان کاغذوں کو پڑھتے اور نوٹس لیتے اور صفحوں کے صفحے لکھتے تھے۔ انہوں نے جیل میں اس قدر لکھا کہ زندگی بھر اتنا نہ لکھا تھا۔ چنانچہ ان کا انگوٹھا اور دائیں طرف سے دوسری انگلی قلم پکڑنے کے باعث سوج گئی تھیں اور انگلی کے سرے پر زخم آگیا تھا۔ اس انگلی کا چھوٹا سا آپریشن ہسپتال ہی میں اسسٹنٹ میڈیکل افسر نے کیا اور پلاسٹر چڑھا دیا۔ جس صبح انہیں لاہور ہائی کورٹ میں فیصلے سنانے کے لئے لے جایا گیا تو ان کی انگلی پر پٹی بندھی تھی۔

مسٹر بھٹو صبح کا ناشتہ بہت سادہ کرتے تھے۔ ڈبل روٹی کے سلائس پر شہد لگا کر کھا لیتے اور اوپر سے کافی کا کپ پیتے تھے۔ دوپہر میں ان کا جو کھانا آتا اس میں سے صرف ایک چپاتی کھاتے تھے۔ سالن بھی کم ہی استعمال کرتے۔ زیادہ وقت کافی پیتے یا سگار استعمال کرتے۔ کھانے پینے کا انہیں چنداں شوق نہ تھا البتہ مہمان نوازی پر جیل میں بھی وہ خاصا خرچ کرتے تھے۔ جیل حکام کی طرف سے انہیں چونکہ اپنے خرچ پر کھانے پینے کی چیزیں منگوانے کی اجازت تھی، لہٰذا انہوں نے ایک آئس بکس منگوایا، روزانہ برف ان کے لئے باہر سے آتی تھی اور پیپسی کولا، آر سی کولا، سیون اپ اور دوسرے مشروبات وہ اپنی جیب سے منگواتے۔ آئس بکس میں ہر وقت ٹھنڈی بوتلیں موجود ہوتی تھیں۔ وہ خود شاذ و نادر ہی استعمال کرتے، البتہ مہمانوں بالخصوص وکلا، مشققیوں اور جیل کے نچلے عملے کو بڑے اصرار سے پیش کرتے تھے۔ جیل میں ان کا ہفتہ وار خرچ اس مد پر کم و بیش ایک ہزار روپے تھا۔ سبز مرچ اور سبزیاں اور پھل بھی اپنے خرچ پر منگواتے۔ مٹر گوشت اور مٹر قیمہ کا سالن زیادہ پسند کرتے تھے، لیکن کھانے کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔ دن اور رات میں صرف ایک بار کھاتے۔ عام طور پر کمرے ہی میں رہتے تھے اور جب کبھی سوچنے کا موقع آتا تو ہاتھ کو منہ پر رکھ کر سوچتے تھے۔ سگار پیتے ہوئے ٹہلنا بھی ان کی عادت تھی۔ شام کے وقت صحن میں بیڈمنٹن کا ایک نیٹ لگا رکھا تھا جہاں وہ دوسرے تیسرے روز چند منٹ کے لئے کھیلتے تھے۔ کھیل میں پوائنٹس کبھی نہ گنتے، محض تفریح اور تھوڑی سی ورزش کے لئے ریکٹ ہاتھ میں پکڑتے تھے۔

مسٹر بھٹو کے کمرے سے باہر نہ آنے کی ایک وجہ جیل کے برج پر موجود تین سپاہی بھی ہوتے تھے۔ جن میں سے ایک کا تعلق محکمہ جیل سے ہوتا، دوسرے کا پولیس سے اور تیسرے کا فوج سے۔ اگرچہ ان سپاہیوں میں سے اکثر مسٹر بھٹو کو دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے سلام بھی کر لیتے، لیکن مسٹر بھٹو ان کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔

مسٹر بھٹو نے سردیوں کی ایک شام اپنے کمرے میں ایک ملازم سے گفتگو کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ۷۲ء میں صدرِ پاکستان کے طور پر جب میں چین گیا تو وہاں ایجنڈے کے لیے ایک لمبی لسٹ تھی جس پر ہمیں بحث کرنا تھی، لیکن شدید سردیوں کے باوجود آزاد کشمیر کے برف زدہ سرحدی علاقوں میں تعینات ہمارے سپاہیوں کے پاس گرم کمبلوں کی شدید کمی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ سپاہیوں کے لیے مناسب گرم کمبلوں کے حصول پر بات کروں۔

رات کو سرکاری ڈنر اور گپ شپ کے بعد ہم اپنے کمرے میں گئے تو میں نے سوچا کہ اسی وقت وزیر اعظم چو این لائی سے اس معاملے پر علیحدگی میں رسمی مذاکرات سے پہلے ہی بات کروں۔ چنانچہ میں نے اوورکوٹ پہنا اور کمرے سے باہر جانے لگا تو میری بیوی نے کہا کہ آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔ اس پر میں نے ازراہِ مذاق اسے جواب دیا، چو این لائی کے ساتھ سونے جا رہا ہوں۔

چو این لائی کے پاس پہنچا اور مسئلے کا ذکر کیا تو انہوں نے کمال مہربانی سے اسی وقت سیکرٹری کو ہدایات لکھوا دیں کہ فوری اتنے لاکھ کمبل پاکستان کے لیے بطور تحفہ بھجوا دیئے جائیں۔

مسٹر بھٹو نے مزید بتایا کہ چو این لائی توتلی انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور نہایت معاملہ فہم اور حالات پر کڑی نظر رکھنے والے انسان تھے۔

مسٹر بھٹو نے کہا کہ انہیں بہت پہلے سے علم تھا کہ چو این لائی قریب المرگ ہیں، کیونکہ انہیں ایک مرض اندر ہی اندر کھاتے جا رہا تھا، لیکن وہ نہایت صبر و تحمل سے اسے برداشت کر رہے تھے اور چینی ڈاکٹر مسلسل ان کا علاج کرتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے، لیکن ہاتھ ملاتے وقت اتنی سختی سے دباتے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے انسان کسی نوجوان سے مصافحہ کر رہا ہو۔

جیل میں مسٹر بھٹو اکثر چین کی ترقی اور خوشحالی کی باتیں کرتے تھے۔ انہیں وہاں کا نظم و ضبط بہت پسند تھا۔

چو این لائی کے علاوہ وہ جن سیاسی شخصیات سے متاثر تھے ان میں سے نپولین کا ذکر کثرت سے کرتے۔ ایک مرتبہ سادہ لوح دو قیدیوں کو انہوں نے بتایا کہ نپولین بچپن ہی سے قائدانہ صلاحیتیں رکھتا تھا اور سمندر پہ نہانے جاتا تو اپنے کم عمر دوستوں کو جمع کر کے وطن کو خوشحال اور سربلند کرنے کے بارے میں لیکچر دیا کرتا۔

جن لوگوں نے مسٹر بھٹو سے بکثرت باتیں کیں ان کا کہنا ہے کہ وہ ہٹلر کی قوم پرستی سے بھی شدید طور پہ متاثر تھے اور ہمیشہ یہ کہہ کر نازی لیڈر کو خراج تحسین پیش کرتے کہ اگرچہ جنگ میں دشمنوں کی تعداد کے سامنے اسے شکست ہوئی، لیکن جس طرح اس نے اپنے ملک اور قوم کو بنایا اور دنیا بھر کے ممالک کو دن میں تارے دکھلا دیئے وہ اس کا کمال تھا۔ مسٹر بھٹو کے مطالعہ کی کتابوں میں ہند کے عروج وزوال پہ کتب بھی شامل رہتی تھیں۔

ملکی شخصیات میں مسٹر بھٹو صرف قائداعظمؒ کا نام احترام سے لیتے تھے۔ دوسری شخصیتوں کے بارے میں وہ ملی جلی رائے کا اظہار کرتے۔

جیل کے قیدیوں اور نچلے عملے کے ارکان میں سے کسی نے ایک روز احمدیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور پوچھا: "صاحب بہادر" یہ مرزائیوں کا مسئلہ آپ نے کیسے حل کیا؟" اس مجلس میں ایک اور سوال یہ ہوا کہ آیا آپ کی ملاقات کبھی ربوہ کے خلیفہ صاحب سے ہوئی ہے۔

مسٹر بھٹو نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مقابلے میں مرزائی برادری کا رویہ دوستانہ تھا اور انہوں نے ہمارے مختلف امیدواروں کی بھرپور امداد بھی کی، لیکن میری کبھی ان کے سربراہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں البتہ جب ان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو میں نے سوچا کہ اُن کے گرو کو بلا کر ذرا بات تو کریں۔ چنانچہ مرزا ناصر احمد کو ملاقات کے لیے بلوایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہوگا، اس لیے کسی مذہبی آدمی کو بلا کر اُس سے پوچھ لوں کہ اس شخص سے کیا بات کرنی ہے۔ چنانچہ مولانا کوثر نیازی کو بلا کر میں نے کافی پوچھ گچھ کی۔ بعد میں مرزا صاحب آئے تو مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ ایک بے ہنگم اور عجیب و غریب قسم کے آدمی تھے۔ سر پہ پگڑ باندھا ہوا تھا۔ گفتگو میں وہ بڑے مرزا صاحب کی پیشن گوئیوں کا ذکر کرتے رہے۔ مجھے ان کی باتوں نے متاثر نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ یہ آپ نے کیا پنگا لے رکھا ہے۔ ستر کروڑ مسلمان سارے یہ مانتے ہیں کہ حضرت محمدؐ ہی آخری نبی ہیں۔ پھر آپ کس چکر میں ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ میری بات مانیں تو آپ بھی حضرتِ محمدؐ کو آخری نبی مانیں تاکہ جھگڑا ختم ہو۔ باقی جہاں تک آپ کی جان و مال کے تحفظ کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری میری ہے، لیکن فتنہ وفساد کو ختم کرانا میرا فرض ہے ——— وہ جواب میں پتہ نہیں کیا کیا باتیں کرتے رہے، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب سارے مسلمان کہتے ہیں تو پھر یہ لوگ یقیناً غلط ہوں گے اور انہیں اقلیت بنا دینا چاہیئے۔ پس میں نے حکم جاری کر دیا۔

مذہب کے بارے میں مسٹر بھٹو کی باتیں بہت سیدھی، سادہ اور دو ٹوک ہوتی تھیں۔ ایک بار اپنے عقائد کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بعض لوگ مجھے شیعہ کہتے ہیں، لیکن میں شیعہ نہیں ہوں بلکہ میرے بزرگ اہلسنت و الجماعت ہیں، البتہ میری دوسری بیوی ضرور شیعہ ہے، لیکن میں سارے فرقوں کی عزت کرتا ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتا ہوں۔ میں مولوی نہیں ہوں۔ البتہ بزرگوں کی بہت عزت کرتا ہوں، شاہ بھٹائی اور شہباز قلندر کا ماننے والا ہوں۔ ان بزرگوں کی بڑی خدمات ہیں اور پاکستان و ہندوستان میں جتنے مسلمان نظر آتے ہیں وہ ان کے طفیل بنے ہیں۔ مسٹر بھٹو مغلیہ خاندان اور دیگر مسلمان بادشاہوں کے متعلق ہمیشہ سخت الفاظ استعمال کرتے اور یہ کہا کرتے کہ انہوں نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی، ورنہ دہلی میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوتی اور آج بھارت ہندوؤں کا ملک نہ ہوتا۔

ملک کی دینی شخصیات میں سے وہ مودودی صاحب کی علمیت کے قائل تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مودودی عالم آدمی ہے۔ عربی فارسی اور مذہب کے بارے میں اس کا کام بہت ہے، لیکن اُس نے سیاست میں آ کر خود کو ذلیل کروا لیا ہے۔ میں اُن کے میدان میں کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے مودودی ہزاروں برس جئیں تو بھی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ مودودی صاحب سے ملنے کیوں گئے تھے، مسٹر بھٹو نے کہا کہ میرا سیکرٹری افضل سعید مودودی کا رشتہ دار تھا اور مجھے ہمیشہ مشورہ دیتا کہ ان سے ملوں۔ انتخابات کے بعد بحران آیا تو اس کے اصرار پر میں نے مودودی صاحب کو لاہور کے گورنر ہاؤس میں بلوایا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کہلوایا کہ وہ چل نہیں سکتے، لہٰذا بھٹو صاحب خود تشریف لے آئیں تو بہتر ہوگا۔ میں اُن سے ملنے گیا تھا اور مودودی صاحب نے بحران ختم کروانے کی کوشش کی بھی تھی، لیکن قومی اتحاد والوں نے ان کی بات نہیں سنی۔

ایک بار کسی نے اصغر خان کا ذکر کیا۔ بھٹو صاحب نے اُن پہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اصغر خان اچھا آدمی ہے، لیکن سیاسی نہیں۔ سیاست میں وہ مجھے رہا کرانے کے نام پر آیا تھا اور اُسے چاہیئے تھا کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارتا تاکہ سیاست کی سوجھ بوجھ سیکھ لیتا، لیکن وہ بڈھے اور نالائق سیاسی آدمیوں میں پھنس گیا اور انہوں نے اسے گندا کر کے نکال دیا۔ اس کی طبیعت میں استقلال نہیں ہے اور اس کی سوچ بھی سیاسی نہیں۔ لائی لگ سا آدمی ہے اور میرے خیال میں آئندہ سو سال تک بھی زندہ رہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی اُسے خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

ولی خان، مینگل اور بزنجو کے بارے میں مسٹر بھٹو بہت بری رائے رکھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں مر جاؤں تو بھی یہ بات

یاد رکھنا کہ یہ لوگ کبھی پاکستان کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ میں نے انہیں اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا ہے، ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ بلا وجہ ان سے جھگڑا لیتا۔ یہ مختلف قسم کے چولے بدلتے ہیں، لیکن ہر چولے میں سے پاکستان دشمن کا چہرہ برآمد ہوتا ہے۔ مسٹر بھٹو نے مزید کہا کہ میں پھر خبردار کرتا ہوں کہ کبھی ان پر یقین نہ کرنا، ورنہ پاکستان کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے بارے میں یہ کہا کہ وہ جتنے چاہیں ولی خان، بزنجو اور مینگل وغیرہ کے ناز اٹھائیں اور انہیں دعوتیں کھلائیں۔ یہ لوگ کبھی اُس کے ساتھ بھی نہیں آئیں گے، کیونکہ یہ پاکستان کے ازلی اور ابدی دشمن ہیں اور ان کا کردار سانپوں اور بچھوؤں کا سا ہے جو کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔

سیاسی افراد کے بارے میں اکثر تذکرے ہوتے۔ مسٹر بھٹو پاکستان ٹائمز" اور "مساوات" پڑھتے تھے اور جب کسی کے بارے میں کوئی دلچسپ خبر آتی تو اپنے مخصوص انداز میں ریمارکس دیتے۔ ایک بار نبی بخش زہری کی خبر پڑھی تو بولے کہ یہ شخص عجیب مسخرا ہے۔ اسے مرغ بازی کی عادت ہے۔ میرے پاس لاڑکانے آتا تو بھی مرغے بغل میں ہوتے تھے۔ نہ جانے کس بے وقوف نے اُسے سیاست کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

بگٹی کے بارے میں بھی ذکر چھڑا۔ بھٹو بولے، یہ شخص میرا ذاتی دوست ہے اور ہمارے خاندانی تعلقات ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی خاندانی تقریبات میں جاتے رہتے ہیں۔ میں نے اُسے ایک بار ساتھ ملانا بھی چاہا، لیکن نظریاتی طور پر یہ میرے ساتھ نہ چل سکا۔ ہمارے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا جو دور نہ کیا جا سکا۔

جی ایم سید کے متعلق بھٹو نے کہا کہ اگرچہ میں ایک بزرگ سندھی سیاستدان کی حیثیت سے اس کی عزت کرتا رہا ہوں، لیکن وہ شخص کبھی پاکستان پر ایمان نہیں لائے گا اور گزشتہ انتخابات میں اس نے محض اس لیے میری مخالفت کی کہ وہ جانتا تھا کہ صرف میں اس کے راستے کی رکاوٹ ہوں اور اگر مجھے پھانسی دے دی گئی جس طرح کہ انتظامات کیے جا رہے ہیں تو جی ایم سید سندھ میں زور پکڑ جائیگا اور میری موت سے مشتعل ہونے والے اس کے نرغے میں آجائیں گے۔ زندہ بھٹو اس کے راستے کی رکاوٹ ہے، لیکن بھٹو کی موت اس کے لیے کار آمد اسلحہ ہوگی اور وہ میرے بدلے کی باتیں کر کے سندھیوں کو ملک کے خلاف اکسائے گا۔

ایک روز ملک غلام جیلانی کی بات ہوئی۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ یہ شخص تو کبھی کا پاکستان توڑ چکا ہے اور ہر وہ سیاستدان جو پاکستان کا مخالف ہے، اُسے پیارا لگتا ہے۔ شیخ مجیب سے ولی خان اور بگٹی تک سب اُس کے یار ہیں۔ لندن میں بیٹھ کر سازشیں کرتا ہے اور کبھی کبھی پاکستان آ کر فتور مچاتا ہے۔

پھر مسٹر بھٹو نے گالی دے کر کہا کہ شاید اُس نے پاکستان کو توڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اُسے پورا کرنے کی آرزو میں مرا جا رہا ہے۔

اپنی پارٹی کے لوگوں کے بارے میں بھی باتیں ہوتی تھیں۔ اکثر یہ سوال ہوتا کہ احمد رضا قصوری کا کیا چکر تھا۔ مسٹر بھٹو کہتے کہ وہ ایک پاگل سا لڑکا تھا۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اُس کے قتل کا حکم دیتا۔ وہ تو جب اُس نے میری بیوی اور بیٹی تک کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا کہ اس کا دماغ درست ہونا چاہیئے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ملازموں نے زیادہ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے اُسے اُڑا دیا ہو، وہ کہتے کہ میں نے بہر حال یہ نہیں کہا تھا، البتہ وہ تسلیم کرتے تھے کہ اکثر اوقات ملازم لوگ خوشامد میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ آپ ان سے کہیں کہ فلاں کا کان مروڑ دو تو وہ سالے کان کاٹ کر لے آتے ہیں۔

جے اے رحیم کے ساتھ بد سلوکی کے ذکر پر ایک بار انہوں نے محض اتنا تبصرہ کیا کہ بڑے میاں کے دماغ میں فتور آگیا تھا اور وہ پاگل ہو گیا تھا۔

انتخابات میں دھاندلی کے الزام میں ملوث وزراء اور پارٹی اراکین کے تذکرے پر مسٹر بھٹو یہ کہتے تھے کہ میں نے کسی حرامزادے کو یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا کرو، اگر کسی نے یہ حرکت کی ہے تو اپنے طور پر کی ہے اور میں اُس کا ذمہ دار کیسے ہو سکتا ہوں۔

کوٹ لکھپت جیل کے جس کمرے میں مسٹر بھٹو کو رکھا گیا تھا، اس میں مسٹر بھٹو کے آخری دور اور انتخابات کے وقت راجہ منور احمد بند ہوتے تھے جو مسٹر حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب کے سیاسی مشیر تھے۔ ایک بار کسی مشقتی نے کہا کہ جناب آپ سے پہلے یہاں راجہ صاحب بند تھے اور انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ اگر مسٹر بھٹو نے اپنی عادات نہ چھوڑیں تو انہیں ایک دن یہیں آنا پڑے گا۔ اس پر مسٹر بھٹو ہنس کر بولے، منور کو چاہیئے نبوت کا دعویٰ کرے کہ اس کی پیشینگوئی پوری ہو گئی۔

جیل کے عملے نے کئی مرتبہ مسٹر بھٹو کو ان کے دور کے سیاسی قیدیوں بالخصوص محمد حنیف رامے پر اندرونِ جیل سختی کے واقعات سنائے اور کہا کہ مسٹر رامے کے کمرے کی بجلی اور پانی بند کر دیا جاتا تھا اور جیل آنے سے پہلے اُن پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس پر مسٹر بھٹو نے کہا کہ یہ سب میرے علم میں نہیں اور نہ ملک کا وزیر اعظم اتنا فارغ ہوتا ہے کہ ایسے احکام جاری کرے کہ ملزموں کا ٹٹی پیشاب بند کر دو۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ میں نے پہلی بار رامے کو ملک امیر محمد خان کے پاس دیکھا تھا۔ میں وزیر خارجہ نہیں رہا تھا اور ملک صاحب سے ملنے آیا تھا۔ ہم باتیں کر رہے تھے تو باہر سے بار بار کسی کی چٹ آتی تھی۔ میں نے پوچھا کون ہے۔ ملک صاحب نے رامے کا نام لیا اور کہا کتابیں لکھتا ہے اور رسالے بناتا ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میرے کہنے پر ملک صاحب نے اُسے اندر بُلایا۔ بعد میں ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور یہ پیپلزپارٹی میں آ گیا۔ میں نے اُسے وزیر بنایا، پھر وزیر اعلیٰ، لیکن اس کی کابینہ کے وزیر شکایتیں کرتے تھے اور پنجاب میں معراج خالد، کھر اور اُس کے درمیان ہمیشہ لڑائی رہتی تھی۔ مجبوراً میں نے اُسے الگ کر دیا تو یہ شور مچانے لگا۔

رامے کے ساتھ ساتھ کھر کا ذکر ضرور آتا۔ کھر کے بارے میں مسٹر بھٹو نے ایک بار کہا کہ اچھا آدمی ہے مگر دماغ میں بدمعاشی ہے۔

حنیظ پیرزادہ کے متعلق مسٹر بھٹو بہت اچھے خیالات کا اظہار کرتے

کہتے تھے کہ اس کا باپ میرا استاد تھا۔ پیرزادہ اچھے خاندان کا اور لائق انسان ہے۔ ممتاز بھٹو کے بارے میں مسٹر بھٹو نے کہا کہ وہ جتنا ہے اس سے اپنے آپ کو دس گنا سمجھتا ہے۔ یہی اس کی خرابی ہے۔

ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کے بارے میں مسٹر بھٹو نے بڑے اچھے موڈ میں یہ واقعہ سنایا کہ ایک بار یہ دونوں لفنگے شراب پی کر میرے گھر کلفٹن میں آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک چھوکری بھی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا اور میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا۔ نوکر نے کہا کہ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو صاحب آئے ہیں۔ میں نیچے آیا تو دونوں نشے میں دُھت تھے اور چھوکری کو دائیں بائیں کھینچ رہے تھے۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے کہا الّو کے پٹھو، یہ میرا گھر ہے کوئی ہوٹل نہیں۔ یہاں میری بیوی اور بچے رہتے ہیں، چلو نکلو یہاں سے۔ بڑی مشکل سے دونوں کو باہر نکالا۔

کوثر نیازی کے متعلق مسٹر بھٹو اکثر کہتے تھے کہ میں اُسے شروع سے جانتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک نمبر ٹھگ ہے، لیکن میرے اردگرد اکثر لوگ ایسے تھے جو پیتے پلاتے بھی تھے اور ان کے دوسرے شغل بھی تھے، مجھے ایک مولوی کی بہت ضرورت تھی جو مسئلہ مسائل بیان کرے، لہٰذا میں نے اس کی ساری حرکتوں کے باوجود اُسے رکھ چھوڑا تھا۔ تم جانتے ہو یہ پہلے جماعت اسلامی کے دفتر میں کلرک ہوتا تھا اور خطوں پر ٹکٹیں لگایا کرتا تھا۔ میں نے اُسے عزت دی اور اپنے ساتھ رکھا، مگر یہ اندر سے منافق تھا اور منافق ہے۔ وہ کسی کا سگا ہو ہی نہیں سکتا۔

جتوئی کے متعلق صرف ایک بار بات ہوئی۔ مسٹر بھٹو نے کہا ڈھنگن آدمی ہے نا ایسے لوگ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔

ایک روز مسٹر بھٹو نے یہ واقعہ سنایا کہ آئین کے مسودے پر دستخط کرانے کے لیے انہوں نے تین لاکھ روپے نقد منگوا کر میز پر رکھے اور پشاور سے ولی خان کو بلوایا۔ ولی خان نے روپے دیکھ کر حامی بھرلی، مگر کہا کہ یہ بہت کم ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ایک بڑی مسجد بنوانی ہے جس کے ساتھ مدرسہ بھی ہوگا۔ اس پر کافی رقم خرچ آئے گی۔ مسٹر بھٹو نے بتایا کہ میں نے حفیظ پیرزادہ کو بلایا کہ یہ زیادہ رقم مانگتا ہے۔ آخر چار لاکھ میں وہ مان گیا۔

(راقم الحروف نے مسٹر بھٹو سے منسوب یہ روایت سننے کے فوراً بعد سنانے والے سے وضاحت چاہی کہ غالباً وہ بھول رہا ہے اور ولی خان مسجدیں یا مدرسے بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر پشاور سے بُلانے کا ذکر ہے تو شاید ان کا دعویٰ مفتی محمود کے متعلق ہو جو دینی مدارس بنواتے اور چلاتے ہیں، لیکن وہ شخص مصر رہا کہ مسٹر بھٹو نے ولی خان ہی کا نام لیا تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ بظاہر یہ درست نظر نہیں آتا، تاہم جو کچھ سنا وہ بلا کم و کاست بیان کر دیا گیا ہے۔)

عورتیں —— یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر اس وقت تک بات نہیں کی جاسکتی جب تک بے تکلفی کی فضا نہ ہو۔ صرف دو افراد ایسے ملے جن سے مسٹر بھٹو نے تین چار بار اچھے موڈ میں اس موضوع پر بھی گفتگو کی۔ ان میں سے ایک چھوٹا افسر تھا —— اور پڑھا لکھا بھی —— ایک روز اس نے خود ہی موضوع چھیڑا اور اخبارات کے تذکروں کے متعلق سوال کیا: "جناب"، یہ حسنہ شیخ کی باتیں بہت چھپ رہی ہیں۔"

اس پر مسٹر بھٹو بولے: دیکھو "بھئی"، میں سیاسی آدمی ہوں، کوئی درویش یا ملا نہیں۔ اس بیچاری عورت کا شوہر مارا گیا تھا۔ یہ روتی پیٹتی میرے پاس آئی۔ میں نے تسلی دی۔ عورت ذہین ہے، گفتگو بلا کی کرتی ہے، تم کیا کہنا چاہتے ہو، یہ اسے پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔ مجھے ذہانت پسند ہے خواہ کہیں ہو۔ اس طرح ہماری دوستی ہو گئی۔ بس۔ اس سے زیادہ سب بکواس ہے۔"

پھر بولے: "یار دیکھو نا میں فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ انسان ہوں، غلطی ملطی سب ہو سکتی ہے اور پھر اس بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ عورت مرد کے لیے ہے اور مرد عورت کے لیے۔

ایک صاحب جن کو پنجابی شاعری سے شغف تھا، مسٹر بھٹو کو اکثر پنجابی کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ مسٹر بھٹو پنجابی زیادہ نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اکثر مطلب پوچھتے تھے۔ ایک بار مسٹر بھٹو سے حسن و عشق کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ زندگی میں بہت کچھ دیکھا، مگر ایک خاتون ایسی تھی کہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی اور کہاں چلی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں فرانس میں پیرس کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا اور ابھی میں نے تعلیم مکمل نہیں کی تھی۔ ہوٹل میں حبس تھا۔ میں نے گلاس ہاتھ میں لیا اور باہر آگیا۔ یہ ہوٹل ایک خوبصورت اور آراستہ باغ کے کونے میں واقع تھا۔ باغ میں مصنوعی پہاڑی بنی تھی۔ میں روشوں پر گلاس ہاتھ میں لیے گھوم رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک نہایت خوبصورت لڑکی پر پڑی۔ وہ سفید پتھر کے بنچ پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی اور مرکری —— ٹیوبس کی روشنی میں کسی یونانی سنگ تراش کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ ایک بار کتاب سے نظریں ہٹا کر اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر کتاب میں محو ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر میں وہاں کھڑا رہا، حتیٰ کہ وہ اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی پہاڑی کی طرف ہو لی۔ میں سحر زدہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھتی اور مسکراتی۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر ایک عجیب واقعہ ہوا، وہ عورت اچانک غائب ہو گئی۔ جی ہاں، بالکل اچانک۔ میں نے باغ کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن وہ دکھائی نہ دی۔ وہ دن اور آج کا دن، اس کی صورت میری آنکھوں میں ہے۔ زندگی میں بے شمار لوگ ملے، خوبصورت چہرے، خوبصورت آوازیں، مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ میرا خیال ہے جس طرح کی باتیں تم لوگ شاعری میں کرتے ہو، بس وہ بالکل ویسی تھی۔

مسٹر بھٹو نے خوبصورتی میں وسطی پنجاب بالخصوص کپور تھلہ کے علاقے کی عورتوں کی بھی تعریف کی اور کہا کہ جہاں تک محنت اور جانفشانی کا تعلق ہے، انہیں چین کی عورتیں پسند آئیں اور وہ ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔

عورتوں ہی کے تذکرے سے ایک روز مسٹر بھٹو نے بعض عرب ممالک کے سربراہوں بالخصوص شیوخ کی رنگین مزاجی کے

قصے بھی سنائے۔ انہوں نے کہا کہ ایک بار میں لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور میرے ساتھ والے کمرے میں ایک عرب ریاست کا سربراہ مقیم تھا۔ اسے جب میرے نام کا پتہ چلا تو ذاتی سٹاف کے ذریعے مجھے مدعو کیا۔ میں اندر گیا تو موصوف نہایت گھٹیا قسم کی شراب پی رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا آپ کے لیے اور منگواتا ہوں۔ پھر انہوں نے ایک ایسی بوتل منگوائی کہ جب اسے کھولا تو شراب کی مخصوص بو کے بجائے سارے کمرے میں مست کر دینے والی خوشبو پھیل گئی۔ اس روز ان کے ساتھ کمرے میں کوئی اور بھی تھا اس لیے میں جلد ہی چلا آیا، تاہم بعد میں ہماری دوستی ہوگئی اور اس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ میں ایوب خان کی وزارت چھوڑ کر اس کے ہاں گیا اور اس نے میری بڑی خدمت کی۔

مسٹر بھٹو نے کہا کہ ان لوگوں کو سوائے کھانے، سونے اور بدمعاشی کرنے کے کوئی کام نہیں۔ خدا نے انہیں دولت دی تھی کہ یہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، لیکن یہ اسے دونوں ہاتھوں سے بدمعاشی پر لٹا رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے اپنے بارے میں کہا کہ میں کوئی فرشتہ نہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے ان فضولیات کے لیے کبھی وقت نہیں ملا۔ میں اس قدر شدید مصروف رہا ہوں کہ کھانے اور سونے تک کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے اپنی کم خوابی کے بارے میں وضاحت کی اور کہا کہ یہ کوئی بیماری نہیں، بلکہ عمر بھر میں نے شدید محنت کی ہے اور مسلسل جاگنے سے اور اپنے اوپر جبر کر کے نہ سونے سے میری نیند ہی اڑ گئی ہے۔

مسٹر بھٹو نے سپین اور مراکش کے درمیان واقع ایک جزیرے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہاں دنیا بھر کے لوگ عیاشی کے لیے جاتے ہیں اور یہ نہ صرف خوبصورت جگہ ہے بلکہ خوبصورت ترین لوگ بھی یہاں عام میسر آتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقتدار سے محروم اکثر سربراہان مملکت کے لیے یہ پسندیدہ جگہ ہے۔ وہ بولے کہ میں زندگی میں چند مرتبہ وہاں گیا، لیکن اس جگہ کے حسن سے ہمیشہ متاثر رہا۔

مسٹر بھٹو نچلے عملے، مشقتیوں اور دیگر غریب لوگوں سے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارا کچھ بھلا ہو جائے، مگر اس ملک کی نوکر شاہی نے میری اصلاحات کا فائدہ تم تک نہیں پہنچنے دیا۔ ایک بار انہوں نے دعویٰ کیا کہ جب کبھی میں تنخواہ بڑھانے کے لیے سب کو جمع کرتا، ہمیشہ گریڈ ۱۷ سے اوپر کی بات ہوتی تھی۔ مسٹر بھٹو نے ایک ملازم کی تنخواہ دریافت کی اور قسم کھا کر کہا کہ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ میرے ملک میں اتنے غریب لوگ بھی موجود ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پنجاب میں صادق حسین قریشی ہمیشہ ہوائی اڑے پر ان سے یہی کہتا تھا کہ سب اچھا ہے۔ ان کے بقول ایک بار وہ گورنر ہاؤس سے اکیلے کار لے کر نکلے اور ریگل سینما کے پاس کار روک کر ایک شخص کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور پوچھا کیا تمہیں آٹا مل رہا ہے۔ وہ شخص پہلے تو مجھے دیکھ کر بہت گھبرایا، پھر بولا جناب کہاں ملتا ہے، بہت غربت ہے اور ہر طرف لوٹ مچی ہے۔ مسٹر بھٹو کا کہنا ہے کہ اس کے بعد میں نے بھنگیوں کی توپ کے سامنے کار روکی اور وہاں ایک شخص سے جس کے ہاتھ میں چھانٹا تھا اور جو کوئی تانگے والا لگتا تھا، یہی سوال کیا، اس نے بھی حکومت کی شکایت کی۔ میں نے واپس آکر قریشی کو ڈانٹا اور سات روز تک لاہور میں بیٹھا رہا اور جب تک تسلی نہیں ہوگئی واپس اسلام آباد نہیں گیا۔

ایک بار قومی اتحاد سے مذاکرات کا ذکر چل نکلا۔ مسٹر بھٹو نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں اتحاد والوں کی شرطیں منظور نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر میں ان کی بات مان لیتا تو وزیر اعظم ہونے کے باوجود میرے پاس کوئی اختیار نہ ہوتا۔ جنرل ضیاء کی آمد کے بارے میں مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ یہ شخص جس نے میرے سامنے وفاداری حلف اٹھایا تھا، مجھ پر ہاتھ ڈالے گا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی طرف سے چن کر ایک شریف اور مذہبی آدمی کو کمانڈر انچیف بنایا تھا۔ مسٹر بھٹو نے ایک بار یہ بھی بتایا کہ ۴ جولائی کی رات بارہ بجے میں نے جنرل ضیاء سے فون کر کے خیریت معلوم کی تو اس نے مجھے سب اچھا کی رپورٹ دی تھی۔ لیکن اسی رات حکومت پر قبضہ کر لیا گیا۔

احمد رضا قصوری کے بارے میں ان کے جو ریمارکس، مختلف وائٹ پیپروں میں چھپے مسٹر بھٹو نے ان کے متعلق یہ کہا کہ میرا ایک سیکرٹری ہوتا تھا جو بالکل میرے اسٹائل پر لکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ سارا کارنامہ اس کا ہو۔ مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ وہ روزانہ کم و بیش ساڑھے تین سو فائلیں خود دیکھتے تھے اور جب تک میز پر کام موجود رہتا، سونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں رات کی نماز پڑھ کر سوتا تھا۔ البتہ راقم الحروف کے استفسار پر جیل کے اکثر ملازموں اور نچلے عملے نے بتایا کہ جیل میں انہوں نے مسٹر بھٹو کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ شاید رات گئے پڑھتے ہوں۔

مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا کہ جب وہ وزیر اعظم ہوتے تھے تو رات گئے نوکروں کو نہیں جگاتے تھے۔ گرم پانی ہر وقت تیار رہتا تھا اور وہ خود ہی کافی بنا کر پی لیتے تھے۔

ایک بار شملہ معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا کہ انہوں نے اندرا گاندھی کے ساتھ علیحدگی میں ایسے مذاکرات کیے اور اسے اس طرح قائل کیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ اندرا اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتی تھی، لیکن مذاکرات کی میز پر میں نے اسے خوب چکمے دیے اور کچھ دیے بغیر سب کچھ حاصل کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ میری مخالف پریس نے بہت اعتراضات کیے تھے کہ بے نظیر بھارت میں کیوں رہ گئی، حالانکہ بے نظیر سے اندرا بہت متاثر ہوئی تھیں اور اسے خصوصی طور پر دعوت دے کر اپنے پاس ٹھہرایا تھا اور کہا تھا کہ یہ میری بھتیجی ہے۔ میں اسے بعد میں بھیج دوں گی۔ اور یہاں سیر کراؤں گی۔

سندھ میں اپنے مخالف سیاستدانوں میں سے انہوں نے ایک بار ایوب کھوڑو کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اگرچہ مجھے ہمیشہ اس کے خلاف جانا پڑا، لیکن یہ شریف آدمی ہے اور دماغ بھی اچھا ہے۔ "تالپور برادران کے متعلق کہا کہ دونوں سنکی ہیں اور ہر وقت الٹے الٹے خیال سوچتے رہتے ہیں۔

مقدمہ قتل میں لاہور ہائی کورٹ نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی اور اب مسٹر بھٹو عدالت میں نہیں جاتے تھے۔ وہ سارا دن پڑھتے رہتے یا کچھ لکھنا شروع کر دیتے۔ ان پر ایک نہ محسوس کی جانے والی بے چینی طاری تھی۔ مسلسل تنہائی کے باعث وہ ہر ملازم یا آنے جانے والے سے باتیں کرنے لگتے تھے اور بعض اوقات تو خود کلامی بھی شروع کر دیتے۔ ایک بار انہیں یہ کہتے سنا گیا کہ وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔

۱۷ اور ۱۸ مارچ کی درمیانی شب انہوں نے چار بجے اسسٹنٹ میڈیکل افسر کو بلایا اور کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ اسسٹنٹ میڈیکل افسر قاضی اپنے کوارٹر سے جو جیل احاطے کے باہر ہے، فوراً وہاں پہنچے۔ مسٹر بھٹو کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ اپنی کوئی تکلیف بیان کرنے کی بجائے انہوں نے کہا کہ ابھی میں سویا ہی تھا کہ میں نے خواب دیکھا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے فیصلہ سنائیں گے اور مجھے موت کی سزا ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔

اسسٹنٹ میڈیکل افسر نے ان کا ملاحظہ کیا اور کہا آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ پھر انہوں نے کافی بنوا کر انہیں پلائی اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ اتنی دیر میں دن نکل آیا اور مشقتی اور اسسٹنٹ میڈیکل افسر وہاں موجود تھے کہ انہیں گارد لینے آ گئی۔ مسٹر بھٹو نے مشقتی سے پوچھا آج کون سے کپڑے پہنوں۔ اس نے خاکی رنگ کے ایک سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ مسٹر بھٹو نے کپڑے پہنے، ناشتہ کیا اور جیل حکام کے ساتھ ڈیوڑھی کی طرف چلے۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد واپس آ گئے۔ وہ خاموش تھے۔ ساتھ میں پولیس کی نفری ضرورت سے زائد تھی جس سے نچلے عملے کو پتہ چل گیا کہ فیصلہ کیا ہوا ہے۔ مسٹر بھٹو کمرے میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

مشقتی نے پوچھا: "جناب، کیا ہوا؟"

"انہوں نے مجھے موت کی سزا دی ہے۔"

مشقتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مسٹر بھٹو کی آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ ایک دنیا کو رلانے والی آنکھوں سے چند آنسو نکلے اور مٹی کی نذر ہو گئے، لیکن جلد ہی مسٹر بھٹو نے خود پر قابو پا لیا اور وہ مشقتی کو تسلیاں دینے لگے۔

اسی روز انہیں سیکورٹی وارڈ سے پھانسی کی کوٹھڑیوں میں منتقل کر دیا گیا، البتہ یہاں بھی انہیں ایک کے بجائے تین کوٹھڑیاں ایک ہی قطار میں دی گئیں۔ ایک کوٹھڑی میں غسل خانہ اور دوسری میں باورچی خانہ تھا۔ درمیان میں ان کے لیے قتل کے قیدیوں والا بستر لگا دیا گیا تھا جو فرش پر تھا۔ ایک رات مسٹر بھٹو نے اسی فرش پر گزاری، البتہ اگلے روز حکومت پنجاب کے اعلیٰ افسروں کی ہدایت پر انہیں پلنگ اور دیگر ضروری سامان پہنچا دیا گیا۔

جیل میں گردش کرنے والی خبروں کے مطابق مسٹر بھٹو کو یقین تھا کہ فیصلے کے خلاف اپیل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، تاہم یحییٰ بختیار نے انہیں رضامند کیا۔ یحییٰ بختیار کے بارے میں جب ان سے شکایت کی گئی کہ شاید وہ ڈھنگ سے کیس نہیں لڑ رہے، اس لیے آپ وکیل بدل کیوں نہیں لیتے تو انہوں نے کہا کہ وہ شروع سے آخر تک سارے کیس سے واقف ہے۔ نئے وکیل کو پھر سے محنت کرنا پڑے گی۔ ویسے مقدمہ لڑنا مجھے کچھ فضول اور بے مقصد سا نظر آتا ہے، اس لیے جیسا چلتا ہے چلنے دو۔

تھوڑے دنوں میں مسٹر بھٹو کی طرف سے سزائے موت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی اور عدالتِ عظمیٰ نے حکم دیا کہ انہیں پنڈی منتقل کر دیا جائے۔ مسٹر بھٹو کا سامان باندھ دیا گیا اور وہ اپنے مشقتی اور جیل کے نچلے عملے سے الوداعی ملاقات کرنے لگے۔ اتفاق سے اس روز بھی انہوں نے سفید کرتہ شلوار پہن رکھی تھی۔ انہوں نے جانے سے پہلے مشقتی کو گھڑی اور کپڑے دیے۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں پیپلز پارٹی کے ان قیدیوں میں بانٹنے کو کہا جو وہاں موجود تھے۔ جب وہ جیل کے دروازے پر آئے تو اسسٹنٹ میڈیکل افسر قاضی کھڑے تھے۔ مسٹر بھٹو نے کہا مسٹر قاضی تم نے میری بہت خدمت کی، لیکن جب میں حکومت میں آیا تو تم میرے پاس نہیں آئے ورنہ میں تمہاری کچھ خدمت کرتا ـــــ اب میں پھر جا رہا ہوں اور اس بار تم نے میری پھر بہت خدمت کی اور میری طبیعت کی خرابی پر تم راتوں کو اٹھ کر مجھے دیکھنے آتے ہو، لیکن اس بار تکلف نہ کرنا، میں لاڑکانہ پہنچ جاؤں تو مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آنا۔ تم وہاں میرے مہمان ہو گے۔ خاص مہمان۔

اسسٹنٹ میڈیکل افسر نے کہا: "جناب، میں پہلے بھی اپنا فرض ادا کیا اور آئندہ بھی کروں گا۔ نہ پہلے کسی صلے کی تمنا تھی، نہ اب۔ خدا حافظ۔"

یہ سن کر مسٹر بھٹو کی آنکھیں نم ہو گئیں شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ لاڑکانہ آنے کی دعوت کبھی قبول نہیں کی جا سکے گی کیونکہ مہمان کوئی دوسرا نہیں اس بار وہ خود ہیں۔ انہوں نے زبان کو ہونٹوں کے نیچے دبایا اور سر جھکا کر سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں داخل ہو گئے جہاں انہیں پنڈی لے جانے والی گارد انتظار کر رہی تھی۔

کوٹ لکھپت جیل کے وہ ملازم اور چند قیدی جنہوں نے مسٹر بھٹو کو آخری بار لاہور جیل سے باہر پنڈی کی طرف جاتے دیکھا، کہتے ہیں کہ عجیب اتفاق ہے جب مسٹر بھٹو کو پھانسی کے لیے چبوترے پر لایا گیا تو انہوں نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سفید کرتا اور سفید شلوار۔

بھارتی اخبارات کی "بھٹو دوستی" کے پردے میں پاکستان کے عوام اور حکومت کے مابین نفرت کی خلیج پیدا کرنے کی کوششیں ملاحظہ کیجئے۔ یہ گستاخ زبان حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور پاکستانی انتظامیہ و فوج میں انتشار کی بے بنیاد خبریں ان گھناؤنے عزائم کو ظاہر کرتی ہیں جو بھارتی پریس، پاکستان کے بارے میں روا رکھتا ہے۔ کیا ہم دشمن ملک کی چھپی ہوئی خواہشات پر پورا اتریں گے، اس کا فیصلہ کرنا ہر پاکستانی کا کام ہے۔

بھٹو اور بھارتی پریس

ترجمہ و مرتب
سلیم چوہدری

ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی کے شمارہ ۵، مارچ ۷۹ء ذوالفقار علی بھٹو نمبر ہے، کچھ چند مضامین کی سرخیاں:

"کیا ضیاءالحق خودکشی کر لیں گے، پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے ضیاءالحق کی خفیہ ملاقاتیں"

"ضیاء کو اندازہ ہو گیا ہے کہ سیاستدان ان کے ہاتھوں بھٹو کا قتل کرا کے آہستہ آہستہ انہیں تختہ دار کی طرف لے جا رہے ہیں!"

"جنرل ضیاء کی دماغی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ وہ خود کو پھانسی کی کوٹھڑی میں محسوس کر رہے ہیں"

"بھٹو کو پھانسی ہوئی تو ہزاروں پاکستانی سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل ہو سکتے ہیں!"

"بھٹو کے وکیل کی بیوی کو قتل کر دیا گیا"

ویسے تو مندرجہ بالا تمام سرخیاں "نئی دنیا اسپیشل" اور کسی کند ذہن صحافی کی ذہنی تخلیق ہیں، مگر آخری سرخی بالخصوص توجہ طلب ہے، لہٰذا ہم اس سرخی کے تحت لگائے گئے مضمون کا اقتباس نیچے دے رہے ہیں تاکہ پاکستان کے اخبار میں لوگ جو گجرات سے پیپلز پارٹی کے سابق سینیٹر کی صاحب جائداد بیوی کے بہیمانہ قتل کے پس منظر سے بخوبی واقف ہیں، بھارتی اخبارات کی مسخ شدہ ذہنیت کا خود اندازہ کر سکیں۔ ملاحظہ کیجئے:-

"بھٹو کے ایک وکیل فخرالزماں پر ضیاء کے دور میں ڈھائے گئے ظلم کی داستان ہم آپ کو سناتے ہیں۔

"فخرالزماں جو پنجابی کے ایک مشہور ادیب ہیں، ان کو پاکستان ٹیلی ویژن سے ہٹا دیا گیا۔ جہاں وہ دو مشہور ہفتہ واری پنجابی پروگرام برسوں سے تشکیل دے رہے تھے۔ اس کے بعد ان کی تین کتابوں پر پابندی لگا کر ان پر مقدمات دائر کر دیئے گئے۔ اس سے زیادہ سنسنی خیز بات یہ ہے کہ فخرالزماں کی چالیس سالہ بے قصور بیوی کو دن دہاڑے لاہور میں قتل کر دیا گیا۔ مختلف اخبارات نے اس قتل سے متعلق یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ محض فخرالزماں کو بھٹو کی مخالفت نہ کرنے کی وجہ سے ان کو دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بیوی کے قتل کے الزام میں فخرالزماں کو پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

پاکستان کے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ فخرالزماں کی بیوی کو چند مربعہ اراضی اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ فخرالزماں اور ان کے والد کی کوشش تھی کہ مذکورہ اراضی اپنے نام کروا لی جائے، مگر فخرالزماں کی بیوی، جو پہلے ہی اپنے خاوند اور سسرال والوں کی بدسلوکی سے نالاں تھی، اراضی سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ فخرالزماں کی دو بیٹیوں کے بیان کے مطابق ان کے ابو اور دادا نے کرایہ کے قاتل بھجوا کر ان کی

اسی کو قتل کروادیا۔ دونوں بچیوں نے اپنی جانیں خطرے میں ہونے کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ ان کے والد اور دادا پر ملٹری کورٹ میں مقدمہ چلایا جائے۔ مقدمہ عدالت میں ہے۔ اس سے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ بھارتی اخبارات بھٹو دوستی کے نام پر ایک خاندانی جھگڑے کو سیاسی رنگ دے کر جو گندا کھیل کھیل رہے ہیں، اس کی تہہ میں دراصل پاکستان دشمنی کا گھناؤنا جذبہ پوشیدہ ہے۔

ہفت روزہ "نئی دنیا"، شمارہ ۱۶ اپریل کی سرخی اور متعلقہ خبر کا اقتباس:

"جنرل ضیاء فوج میں بھی اپنے دشمن بنا رہے ہیں۔"

"فوجی افسروں نے بھٹو کی حمایت شروع کر دی۔"

"...... جنرل ضیاء کا مسئلہ یہ ہے کہ اب تک تو نچلے (فوجی) افسر دبی زبان سے بھٹو کی جاں بخشی کی باتیں کر رہے تھے، لیکن اب انہوں نے کھلم کھلا بھٹو کی حمایت شروع کر دی ہے۔ ہزاروں افسروں کے دستخطوں سے جنرل ضیاء کے سامنے کئی پٹیشن پیش کیے جا چکے ہیں جن میں جنرل ضیاء سے بھٹو کی جاں بخشی کی اپیلیں کی گئی ہیں۔ پاکستان کے اخبارات، بی بی سی، اور مغربی اخبارات کے نمائندوں نے یہ اطلاعات بھیجی ہیں کہ سرکار کے نچلے حلقوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے ...... ان حالات نے جنرل ضیاء کی نیند حرام کر دی ہے۔"

اسی اخبار کی ایک دوسری "سپیشل" ملاحظہ کیجئے۔

"غداری اور ملک دشمنی کا مقدمہ چلا کر بے نظیر اور نصرت بھٹو کو بھی پھانسی دیدی جائیگی۔"

"پاکستان کے حکمران بھٹو کی شیر دل بیٹی بے نظیر اور باہمت بیوی نصرت سے سخت خوفزدہ ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو کسی بھی قیمت پر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اپنی اس سازش کو عملی شکل دینے کے لیے پاکستان کے فوجی حکام نے ایک نہایت ہی طفلانہ چال چلی ہے۔ بھٹو کو قتل کرنے سے پہلے کراچی اور لاڑکانہ میں بھٹو کے گھروں پر چھاپے مارے اور کہا کہ وہاں سے کچھ ایسی دستاویزات اور کاغذات برآمد ہوئے ہیں جن سے پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ بھٹو کے رشتہ داروں کا ارادہ ان دستاویزات کو ملک سے باہر سمگل کر کے غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں میں پہنچانا تھا۔ دراصل یہ ڈرامہ اس لیے کھیلا گیا ہے تاکہ بے نظیر، نصرت اور بھٹو کے خاندان کے دوسرے افراد پر ملک سے غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا جا سکے۔ پاکستان میں ملک سے غداری کی سزا موت ہے۔ ان سنگدل انسانوں سے ہرگز یہ بعید نہیں کہ یہ بھٹو کی بیٹی اور بیوی کو عدلیہ کی ملی بھگت سے سزائے عمر قید یا سزائے موت دے دیں۔"

پاکستان میں مسٹر بھٹو اور بھارت میں مسز اندرا گاندھی نے اپنی اپنی آمریت قائم کرنے کے لیے عدلیہ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ عین جمہوریت تھی۔ اب اگر پاکستان میں عدلیہ کو ہر آزادی حاصل ہے تو اس کے آزادانہ فیصلے بھی پاکستان کے دیرینہ "کرمفرماؤں"، کو انتظامیہ سے ملی بھگت کا نتیجہ نظر آ رہے ہیں۔

عام دنوں میں بالعموم اور بھٹو کی موت کے بعد بالخصوص کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا ہوگا جب سعودی عرب کی کوئی نہ کوئی شخصیت پاکستان میں موجود نہ رہی ہو۔ حال ہی میں سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ الفیصل پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سعودی عرب کے مالیاتی اداروں کی شاخیں پاکستان میں قائم کرنے اور ان کے ذریعے پاکستان کی ترقی کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا، لیکن بھارتی اخبارات جو بھٹو دوستی کے بھیس میں پاکستان دشمنی کے جوش میں اندھے ہو رہے ہیں ذرا ان کی بھی سنیئے:

"شاہ خالد اور یاسر عرفات سے وعدہ خلافی کر کے ضیاء نے عالم اسلام کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔"

"دنیا کا کوئی باضمیر انسان آج ...... جنرل ضیاء پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"ضیاء نے سعودی عربیہ کے حکمران شاہ خالد کے خصوصی ایلچی اور پاکستان میں سعودی سفیر جناب ریاض الخطیب سے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ وہ بھٹو کو پھانسی پر نہیں لٹکائیں گے، مگر ضیاء نے یہ وعدہ توڑ دیا۔ ضیاء کی اس حرکت پر شاہ خالد تو ناراض ہیں ہی، جناب ریاض الخطیب کا تو غصہ سے برا حال ہے، کیونکہ انہوں نے ضیاء سے کئی بار گفتگو کرنے کے بعد شاہ خالد کو یقین دلایا تھا کہ بالآخر ضیاء بھٹو کو رہا کر دیں گے۔ ان ہی بنیادوں پر شاہ خالد پاکستان کی امداد کر رہے تھے۔ ضیاء نے ان سے وعدہ خلافی کر کے ان کے چہرے پر زبردست طمانچہ مارا ہے۔ سعودی سفیر نے ریاض پہنچ کر شاہ خالد سے ملاقات کی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس احسان فراموش ...... اور ...... حکمران کی امداد بند کر دیں۔"

ہر پاکستانی جانتا ہے کہ بھٹو کی موت کے دو دن بعد امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر دی تھی۔ گزشتہ ہفتے "صحافت" میں "فار ایسٹرن اکنامک ریویو" کے ایک مضمون کا ترجمہ چھپ چکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے اتنا ناراض ہے کہ وہ پاکستان کو اس سے روکنے کے لیے موجودہ حکومت کے خلاف کوئی بھی اقدام کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں ساون کے اندھے بھارتی اخبار نویسوں کو کیا نظر آ رہا ہے، اس کا اندازہ درج سرخیوں اور خبر کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"بھٹو کا اثر کم کرنے اور ایشیا کو سامراج کا غلام بنانے کے لیے کارٹر اور ضیاء کی ملی بھگت۔"

"دراصل پاکستان میں ایٹمی دھماکہ کا سہرا بھٹو کے سر ہوگا۔ پہلے امریکہ اس کا مخالف تھا، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ بھٹو یہ بم فلسطینیوں کے حوالے کر سکتے ہیں، مگر اب پاکستان اس کی کٹھ پتلی بن گیا ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنائے تاکہ ایشیا میں اسے سامراج مخالف ممالک کو دھونس دینے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔"

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ بھارت کو ایٹمی طاقت بنانے رکھنے کے لیے ہر ممکن مدد دے رہا ہے جبکہ پاکستان کی امداد بندی اس الزام میں کی گئی ہے کہ پاکستان کہیں ایٹمی طاقت نہ بن جائے، مگر منطق اور دلیل سے عاری بھارتی اخباروں کی نظر میں پاکستان پھر بھی امریکی کٹھ پتلی ہی قرار پاتا ہے۔

"صحافت" کے قارئین جو تارا مسیح کا انٹرویو پڑھ چکے ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ بھٹو کو پھانسی لگانے میں اس کا کیا جرم ہے اور اپنا فرض پورا کرنے کے بعد وہ روپوشی یا نظر بندی کے بجائے کیسے کھلے بندوں بہار کالونی، کوٹ لکھپت میں رہ رہا ہے، مگر بھارتی اخبارات جو ہمیشہ سے خود ساختہ اور بے پر کی اڑانے میں خصوصی شہرت کے مالک ہیں، ان کے سرگردہ ہفت روزہ "نئی دنیا"، شمارہ ۳۰ اپریل ۷۹ء کا تارا مسیح کے بارے میں تبصرہ پڑھیئے اور سر دھنیئے:

"تارا مسیح، بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد سے غائب ہے۔ وہ واپس اپنے گھر نہیں آیا۔ پاکستان کے عیسائی اس کے منہ پر تھوک رہے ہیں۔ پاکستان کے کئی چرچ تارا مسیح کو عیسائیت سے خارج کر چکے ہیں۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ تارا مسیح کو پاکستان سرکار نے ایک بڑا لالچ دے کر اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ اس وقت تارا مسیح پاکستانی فوج کی حفاظت میں کہیں روپوش ہے، لیکن جلد ہی اُسے ملک کے کسی گمنام حصے میں مکان وغیرہ دے کر بسا دیا جائے گا یا پھر اُسے کسی دوسرے ملک بھیج دیا جائے گا۔ تارا مسیح کو اتنا پیسہ دیا گیا ہے کہ اب اُسے مزید پھانسیاں دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ہونے والی کمائی کو وہ زندگی بھر کھا سکتا ہے۔"

بھارت میں علی گڑھ کے بعد جمشید پور میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ خونِ مسلم پانی کی طرح بہایا گیا، مگر خواجہ احمد عباس جیسے سیکولر دانشوروں کو اس کے بارے میں احتجاج تو کجا منظ

مسلمانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کی توفیق نہ ہوئی۔ یہی خواجہ احمد عباس ہفت روزہ "بلٹز" بمبئی میں اپنے مستقل کالم کے تحت لکھتے ہیں:

"ایک تو راولپنڈی جیل میں پھانسی تھی جس پر ایک نام کے "مسیح" نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیدی۔ پھانسیاں ہوں کہ قتل گاہیں، بات ایک ہی ہے اور بات ہولناک ہے۔ ایران میں سینکڑوں کو اڑادیا گیا، مگر کہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن ایران کا انقلاب نہ جانے آگے آرہا ہے کہ پیچھے جارہا ہے۔"

انسانیت پرست خواجہ صاحب! انقلاب روس کے بعد جو انسانوں کا خون بہایا گیا، بلکہ آج تک بہایا جارہا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب تک ہٹلر روس کا اتحادی رہا، آپ دوسری جنگ عظیم میں قتل ہونے والے انسانوں کے بارے میں خاموش رہے، لیکن جونہی ہٹلر نے روس پر حملہ کیا آپ نے چرچل اور روزویلٹ کو جمہوریت کے چیمپئن قرار دینا شروع کردیا۔ قبلہ آپ ایسے ترقی پسندوں کی اسی "ایک بام و دو ہوا" کی پالیسی نے آپ کو عوام کی نظروں میں راندۂ درگاہ بنائے رکھا ہے۔ اب کم از کم بڑھاپے میں تو ڈنڈی مارنا چھوڑ دیں۔

خواجہ صاحب پھانسی کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:

"دنیا کے ہر ملک میں پھانسیاں گڑی ہوئی ہیں، سولیاں لگی ہوئی ہیں، فائرنگ اسکواڈ ہاتھوں میں رائفلیں لیے ہوئے تیار ہیں۔ ایٹم بم مار ہوائی جہاز اڑنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ بھی تو لاکھوں کروڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک عظیم انسانی پھانسی ہی ہے"۔

ہمیں خواجہ صاحب سے اتفاق ہے کہ ہر ملک میں پھانسیاں اور سولیاں لگی ہوئی ہیں۔ ایٹم بم مار ہوائی جہاز اڑنے کے لیے تیار ہیں، ان ملکوں میں خواجہ صاحب کا بھارت بھی شامل ہے جہاں گلی گلی اور کوچے کوچے میں مظلوم مسلمانوں کو پھانسی لگایا جارہا ہے۔ بھارتی جنگی طیارے ایٹمی اسلحہ سے لیس تیار کھڑے ہیں اور ان کا رُخ پاکستان کے غریب عوام کی جانب ہے، مگر افسوس خواجہ صاحب نے اپنے ملک کی پھانسیوں اور جنگی طیاروں کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں لکھا اور نہ کبھی لکھیں گے، کیونکہ خواجہ صاحب جیسے لوگوں نے اپنا قلم اور ضمیر گروی رکھ چھوڑا ہے۔

اب ہفت روزہ "عوام"، نئی دہلی شمارہ ۲۰ اپریل ۷۹ء چند "شاہکار" سرخیاں ملاحظہ کیجئے:

"پاکستان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی"۔

"خیبر سے کراچی تک فوج سے جم کر مقابلہ"

"بھٹو کے فدائیوں نے سر سے کفن باندھ لیا۔"

"پاکستانی عوام کے پہلے ہی حملے میں فوجی حکومت ریت کی دیوار ثابت ہوئی"۔

ان سرخیوں پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں ✳

ہفت روزہ عوام نئی دہلی کے "شہید انسانیت نمبر" سے ایک مضمون ملاحظہ کیجئے اور لطف اٹھایئے کہ جس صحافی خاتون (فہمیدہ ریاض) کا ذکر تبصرہ نگار نے نہایت نفرت سے کیا ہے وہ آج کل آواز کی پبلشر اور ایڈیٹر ہیں جو پیپلز پارٹی اور بھٹو کے حامی اخبار الفتح کراچی کا دوسرا نام ہے۔

بھٹو کے قتل کا جشن

مشاعرے اکثر و بیشتر ہوتے رہتے ہیں اور آپ ان کی روداد بھی پڑھتے رہتے ہوں گے، لیکن ہم آج ایک ایسے مشاعرے کی بابت لکھ رہے ہیں کہ جسے پڑھ کر عالم انسانیت کا سر شرم سے یقیناً جھک جائے گا، یہ مشاعرہ دہلی کے پاکستانی سفارتخانے میں چھ اپریل کی رات کو منعقد ہوا اور چند گھنٹے جاری رہ کر ختم ہوگیا، لیکن ایک ایسی کہانی مرتب کر گیا کہ جس کے ذریعہ نظام مصطفےٰ کے خود ساختہ علمبردار کے پرفریب اور ذلیل ذہن کے تہہ در تہہ پردے چاک ہوگئے۔

قارئین کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ جس ملک کا صدر اپنے بنائے ہوئے پراگندہ نظام کے سہارے پاکستان کے امن و استحکام کو کوڑے مار مار کر موت کی نیند سلا رہا، برصغیر کی عظیم شخصیات کو نظامِ مصطفےٰ کا لیبل لگا کر اپنا زہر پلا رہا ہے اسی بے دال کے ..... نمائندے دہلی میں بیٹھے ہوئے نظامِ مصطفےٰ کا گریبان چاک کررہے ہیں، شراب نوشی کی محفلیں منعقد کررہے ہیں، پی رہے ہیں چھلکا رہے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ غیر مسلموں کے ذہنوں میں ایسا عکس چھوڑ رہے ہیں کہ شاید ایک بار پھر اسلام دشمن طاقتیں یہ آواز بلند کریں کہ اسلام محبت اور خلوص سے نہیں پھیلا بلکہ تلوار اور کرپشن سے پھیلا ہے۔

یہ مشاعرہ شہید انسانیت ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے تیسرے دن منعقد ہوا، ہمیں یقین ہے کہ اس شکل میں سفارتخانے کے لوگوں نے بھٹو کے قتل کا جشن منایا ہے تاکہ اپنے کج نظر آقا کے سامنے اپنی بے لوث وفاداریوں کا اظہار کرسکیں۔ اس مشاعرے میں نہ صرف شاعروں کے لیے بلکہ مے نوش سامعین کے لیے بھی شراب چھلک رہی تھی۔ پاکستان سے آئی ہوئی ایک خاتون صحافی سر محفل شراب کے جام میں چسکیاں لگاتی رہیں، کچھ شعرا حضرات نے ظرف سے زیادہ پی کر نوٹنکی والی اداکاری شروع کردی تھی۔

اس مشاعرے کا دوسرا پہلو جو انتہائی ذلت آمیز اور قابلِ نفرت ہے وہ یہ ہے کہ اراکین مشاعرہ نے دہلی کے بہت سے شعراء کو مدعو کیا تھا، لیکن حساس، باغیرت اور انسانی جذبات سے لبریز کچھ شعراء نے اس دعوت کو انتہائی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور مشاعرے میں شرکت نہیں کی، لیکن بعض مرغ شناس شاعروں نے اپنی ایک شب کی روزی روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اس مشاعرے میں پہنچ کر بھرپور بے حسی، انسانیت سوزی اور اپنے کھوکھلے ذہنوں کا مظاہرہ کیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ بھٹو کا غم منانا ہر شخص کے لیے لازمی ہو، لیکن کچھ انسانی جذبات کا بھی معیار ہوتا ہے اور اسی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے رحم اور ظلم میں، روشنی اور تیرگی میں صداقت اور فریب میں تخصیص کی جاتی ہے اگر ایسا نہ ہوا کرے تو اشرف المخلوقات، کا لیبل انسان کے ماتھے سے ہٹا کر گدھوں اور کتوں پر چسپاں کردیا جائے۔

جن شاعروں نے اس قابلِ ملامت مشاعرے میں شرکت کی ان میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں:

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، گلزار دہلوی، پاکستانی شاعر مظفر وارثی اور فہمیدہ ریاض، عزیز وارثی عزیز اندوری، نسیم مخموری اور واحد سحری، ان کے علاوہ کچھ صحافی حضرات بھی شریک ہوئے۔ محفل میں مرکزی وزیر سکندر بخت اور سابق کانگریسی ایم پی یونس سلیم بھی بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے۔

جنرل ضیاالحق کا اگلا قدم بھارت سے جنگ ہوگا

ستندر سنگھ کے قلم سے پندرہ روزہ انگریزی رسالے
"دی فورٹ نائٹ" نیو دہلی میں شائع ہونیوالے ایک شرانگیز مضمون کا ترجمہ

پاکستان کے شعلہ مزاج، خوبصورت اور اَرسٹو کریٹ، سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ۴ اپریل کے ابتدائی گھنٹوں میں پھانسی دے دی گئی۔ بھٹو کو پھانسی کے رستے کو بوسہ دینا پڑے گا، یہ حقیقت اسی روز سے واضح تھی جب دو سال قبل "غاصب" جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ جنرل ضیاالحق کی جگہ کوئی بھی شخص ہوتا، وہ بھی اپنے مقابلے میں اقتدار کے متبادل دعویدار کو موجود رہنے اور پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ پاکستان میں جو صورتِ حال بن رہی تھی۔ اور جنرل ضیاء الحق پر بین الاقوامی حلقوں کی جانب سے جسطرح دباؤ ڈالا جا رہا تھا، جنرل ضیاء الحق کے سامنے یہی واحد راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے "سابق محسن" کو جلد از جلد ٹھکانے لگا دیں۔

سیاست ایک گندا ہی نہیں، بلکہ سنگدلانہ کھیل بھی ہے۔ اس کھیل میں انسانی رحمدلی کا دودھ زہر میں بدل جاتا ہے اور ہر شخص اپنے بڑے سے بڑے مہربان کو ضمیر کی معمولی سی خلش محسوس کیے اور انسانی تعلقات کے تقاضوں کی پرواہ کیے بغیر آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر جنرل ضیاء الحق وہ کچھ نہ کرتے جو انہوں نے کیا ہے۔ تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا۔

اگر جنرل ضیاء الحق یہ سمجھتے ہیں کہ بھٹو کو ختم کر کے انہوں نے اپنے تمام مسائل حل کر لیے ہیں تو اسے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں ذہانت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ درحقیقت بھٹو کا بھوت زندہ بھٹو سے زیادہ طاقتور ثابت ہوگا۔ یہ بھوت زیادہ غضبناک حالت میں ان کا پیچھا کرے گا، کیونکہ بھٹو درج ذیل وجوہات کی بنا پر اپنے ہموطنوں اور مخصوص عالمی حلقوں کی نظروں میں شہید کا رتبہ حاصل کر گیا ہے:

- یہ بھٹو ہی تھا جس نے ایک شکست خوردہ اور منتشر پاکستان کو اس کے مسائل سے نجات دلائی۔ چنانچہ اُسے مردہ پاکستان میں جان ڈالنے والے کی حیثیت سے پاکستان کا دوسرا قائد اعظم قرار دیا جا سکتا ہے۔
- وہ نہایت ذہین اور خوش اخلاق پاکستانی تھا جو دنیا کے کسی بھی لیڈر سے رُو در رُو بات کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔
- وہ اپنے سیاسی مستقبل کی پرواہ کیے بغیر بعض چیزیں، مگر فوری معاملات سے بلند رہ سکتا تھا۔ ہمیں اس میں شبہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں بھٹو کے علاوہ کوئی بھی دوسرا پاکستانی لیڈر شملہ کانفرنس میں حصہ لے سکتا تھا۔
- وُہ جدیدیت کا علمبردار تھا اور اُس نے جماعت اسلامی کے اسلامی تجدیدیت اور ظلمت پرستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔
- اپنی قوم کے لیے اس کی خدمات اس جرم سے بدرجہا وزنی تھیں جس کے لیے اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔
- آخری دم تک رحم کی اپیل نہ کر کے وہ شخصیت پرست پاکستانی قوم کی عقیدت کا مرکز بن جائیگا۔

بھٹو کی موت کے بعد گوجرانوالہ، کوئٹہ اور کراچی میں جو دھماکہ خیز ہنگامے ہوئے وہ اس پریشان کن صورتحال کی نشان دہی کرتے ہیں جسکا پاکستانی حکمرانوں کو سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان بھر میں عنقریب خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ جنرل ضیاالحق بلاشبہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، لیکن ملک میں عوامی بیداری کی جو لہر اٹھنے والی ہے اسے روکنا ممکن نہ ہوگا۔ دو ہزار سالہ شہنشاہیت کی وراثت کے دعویدار سابق شاہ ایران اپنا تاج صرف اس لیے نہ بچا سکے کہ انہوں نے اپنے عوام کو ناراض کر دیا تھا۔ جنرل ضیاالحق کے لیے بھی عوامی غم و غصے کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوگا۔ ان کا انجام زود یا بدیر دوسرے غاصبینِ اقتدار سے مختلف نہ ہوگا۔

پاکستانی ڈکٹیٹر (کم از کم وقتی طور پر ہی سہی) اپنی کھال اور گدی صرف اسی طرح بچا سکتا ہے کہ وہ حسبِ سابق بھارت کے خلاف فوجی مہم جوئی کا راستہ اختیار کرے، اگرچہ یہ راستہ بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ پاکستان کے پڑوسی ممالک —— افغانستان اور ایران عدم استحکام کا شکار ہیں۔ ان ممالک کے حکمران اپنے عوام کو —— جن کے منہ کو ایک مرتبہ خون لگ چکا ہے —— راہِ راست پر لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان حالات میں وہ اپنی مشکلات کم کرنے اور اپنے عوام کی توجہ کہیں اور الجھانے کے لیے کوئی ایسا اقدام بھی کر سکتے ہیں جو پاکستان کے مفاد میں نہ ہو۔ افغانستان پہلے ہی پاکستان کے صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں پر اپنے حق کا دعویدار ہے۔ اسی طرح ایران سوئی گیس سے مالا مال صوبہ بلوچستان کے کچھ حصوں کی ملکیت پر حق جتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق شطرنج کے اس کھیل کو کسی مخصوص نگاہ سے دیکھتے ہوں اور افغانستان اور ایران میں پائے جانے عدم استحکام کی وجہ سے دونوں ملکوں کو اپنے لیے کسی فوری خطرہ کا باعث نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ وہ دو وجوہ سے بھارت کے ساتھ بحران پیدا کر سکتے ہیں۔

اولاً اپنے سادہ لوح عوام کو پاکستان پیپلز پارٹی کے اثر سے نکالنے کے لیے اور دوئم اپنے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت کا رخ بھارت کی جانب پھیرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں،

تاہم یہ ضروری نہیں کہ جنرل ضیاء الحق اپنے اس خطرناک کھیل میں کامیاب بھی ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستانی فوج ابھی تک ان زخموں کو چاٹ رہی ہے جو بھارت نے سات آٹھ سال پہلے اسے لگائے تھے، پھر پاکستان کی پسماندہ معیشت افراطِ زر اور زرعی و صنعتی شعبے میں بڑھتی ہوئی بے چینی کی وجہ سے شدید انتشار کا شکار ہے۔ دوسری جانب بھارت کی صنعتی بنیاد نہ صرف بہت وسیع ہو چکی ہے، بلکہ اس کی فوجی استطاعت بھی پاکستان سے کہیں زیادہ مضبوط اور اعلیٰ ہے۔

لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہوگا کہ جنرل ضیاء الحق اپنے "کانٹوں کے تاج" کو وقتی طور پر برقرار رکھنے کے لیے اتنے وزنی دلائل پر کوئی توجہ دیں گے، یہ حقیقت ہے کہ معروضی حالات کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے دنیا کے تمام آمروں اور غاصبوں کے انجام پر پہلے ہی مہر لگ چکی ہوتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دریں حالات بھارت کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنے تحفظ کی جانب سے غافل نہ رہے۔

چند ہفتے قبل تک حکومت میں شامل

جماعتِ اسلامی پاکستان کی قراردادیں پڑھ لیجیے!

یہ جماعت کیا سوچتی ہے، کیا چاہتی ہے، کیا کرتی ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ۵ مئی ۹۰ء کو امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد کی زیر صدارت ہوا۔ اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

معاشی امور کے بارے میں

مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان ملک کے معاشی اور مالیاتی حالات کا جائزہ لے کر اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ ملک کی معاشی ترقی کے لیے جو ترجیحات گزشتہ سالوں میں مرتب کی گئی ہیں وہ معاشی نقطہ نظر سے غیر حقیقت پسندانہ اور اسلامی نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ اسلام کا مقصد ایک منصفانہ معیشت کا قیام ہے جس میں غربت اور ظلم و استحصال ختم ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ افرادِ معاشرہ معاشی جدوجہد میں شریک ہو کر باعزت زندگی گزار سکیں۔

ویسے تو معاشی پالیسی شروع ہی سے غیر متوازن اور غیر منصفانہ تھی، لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد تو پورے نظام کو اس طرح تباہ کیا گیا ہے کہ نہ پیداوار میں اضافہ واقع ہو رہا ہے اور نہ منصفانہ تقسیم اور عوامی فلاح کا حصول ممکن رہا ہے۔ موجودہ حکومت بڑی حد تک ماضی کے بنائے ہوئے نقشہ پر چل رہی ہے اور چند اچھی اصلاحات کے باوجود ابھی تک ایک نیا دروبست قائم نہیں ہو سکا۔ پہلے بھی بجٹ پر پارلیمنٹ کی گرفت مفقود تھی اور سال رواں کا قومی بجٹ بھی ایسے وقت تیار اور نافذ ہوا تھا جب قومی اتحاد حکومت میں شامل نہ تھا۔

مجلس شوریٰ حکومت کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ اسے آئندہ بجٹ کو عوامی توقعات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ مجلسِ شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ ہماری معاشی مشکلات کا حل عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ مزید بڑھانے میں نہیں بلکہ معاشی ترجیحات کو از سر نو مرتب کرنے اور ان کی روشنی میں نئی حقیقت پسندانہ پالیسیاں وضع کرنے میں ہے تاکہ معاشی انصاف اور منصفانہ دولت کے ساتھ ساتھ بہتر کارکردگی اور زیادہ سرمایہ کاری کے لیے فضا سازگار ہو سکے۔

حکومت کو یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد معاشی دشواریوں سے دوچار ہے اور رشوت، گرانی اور ٹیکسوں کے موجودہ نظام نے ان کی کمر توڑ رکھی ہے۔ حالات کو قابو میں لانے کے لیے معاشی پالیسی میں بھاری تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور اس کا ایک اہم حصہ ٹیکس کے موجودہ نظام کی اصلاح ہے جو اس وقت رشوت اور بدعنوانیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے اور جس کے ذریعہ انکم ٹیکس اور ایکسائز انسپکٹر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے ایک طرف معاشی فضا کو مکدر کر رہے ہیں اور دوسری طرف قومی خزانہ کو بیش بہا آمدنی سے محروم کر رہے ہیں۔ اس طرح زکوٰۃ اور عشر کے قانون کے نفاذ کا بھی تقاضا ہے کہ ٹیکس کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ اس لیے مجلسِ شوریٰ حکومت کو متوجہ کرتی ہے کہ نئی معاشی پالیسیوں کی تشکیل اور خصوصیت سے نئے بجٹ کی تیاری میں عوامی جذبات و احساسات کو سمجھنے اور ان کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرے اور محض نوکر شاہی پر انحصار نہ کرے۔ حکومت کی کوشش ہونی چاہیے کہ معاشی ترجیحات کو درست کرے، سرکاری مصارف میں کمی کرے، بنیادی ضرورت کی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کو سختی کے ساتھ روکے، مالیاتی خسارہ کاری کو لگام دے، تعیشات اور غیر ضروری اشیاء کی درآمد اور ٹیکس کے نظام کو سہل اور منصفانہ بنائے۔ آج ملکی معیشت کی اصل ضرورت ٹیکسوں میں اضافہ نہیں معیشت کی غلط اور ناکارہ تنظیم ہے اور ان کی اصلاح ہی کے ذریعہ معیشت کی حقیقی بحالی ممکن ہے۔

ٹریفک حادثات کے بارے میں

مرکزی مجلسِ شوریٰ کا یہ اجلاس ملک میں بڑھتے ہوئے ریل اور ٹریفک حادثات پر اپنی شدید تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ شہریوں کی جان کی حفاظت کرنا حکومت کا اولین فرض ہے، لیکن اس بارے میں حکومت اپنے فرض کی ادائیگی میں بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ اندوہناک حادثوں کے بعد جن میں بہت سی قیمتی جانیں چشم زدن میں لقمہ اجل بن جاتی ہیں، تحقیقاتی کمیٹیاں تو قائم ہو جاتی ہیں، لیکن قوم ان کے نتائج سے لاعلم رہتی ہے اور عملاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اگر

چند چھوٹے ملازمین تادیبی کارروائی کی زد میں آبھی جاتے ہیں تو حکام بالا بالعموم محفوظ ہی رہتے ہیں۔ حادثات کے اسباب کا سدِباب نہیں کیا جاتا اور اب تو یہ خونی حادثات اس درجہ بڑھ چکے ہیں کہ ہمہ وقت ہر شہری ان کی زد میں نظر آتا ہے۔

یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان حادثات کی روک تھام کے لیے فوری طور پر موثر اقدامات کرے اور تمام ریلوے کراسنگ پر چوکیداروں کا تقرر کیا جائے۔ مجلسِ شوریٰ یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ متاثرین کو بلاتاخیر معقول مالی معاوضہ ادا کیا جائے تاکہ ان کی موجودہ معاشی پریشانیوں کا کچھ مداوا ہو سکے۔

کپاس اور دوسری زرعی پیداوار کے بارے میں

زرعی، صنعتی اور اقتصادی میدان میں کپاس کی اہمیت کے باوجود یہ امر باعث تشویش ہے کہ ۳۲ سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک حکومت کپاس کی فصل کا بروقت صحیح تخمینہ لگانے کا انتظام کرنے میں ناکام رہی ہے۔ فصل کا تخمینہ لگائے بغیر حکومت کے لیے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ وہ نفع بخش اور حقیقت پسندانہ کاٹن پالیسی مرتب کر سکے۔ چنانچہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں فصل کے ناقص اور غلط تخمینوں کے باعث خود حکومت کو بلاوجہ روئی کے برآمدی سودے منسوخ کرنا پڑے جن کے نتیجہ میں بھاری تاوان ادا کرنا پڑا اور اس طرح زرمبادلہ کی شکل میں کثیر نقصان برداشت کرنے کے علاوہ عالمی منڈی میں خفت بھی برداشت کرنا پڑی۔ آج کاشتکاروں، تاجروں اور کارخانہ داروں کی ایک بڑی تعداد اقتصادی بحران کا شکار ہے۔ اس کے اسباب میں صحیح معلومات کا بروقت حاصل نہ ہونا بھی ایک اہم سبب ہے۔

مرکزی شوریٰ کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے اپیل کرتا ہے کہ وہ صورت حال کا نوٹس لے اور اصلاح احوال کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ کپاس سے متعلق افراد کا اصرار ہے کہ حکومت نے انہیں بحران سے نکالنے کے لیے واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ۴۵۰ روپے فی من کے حساب سے روئی خرید کرے گی، لیکن حکومت کا مؤقف ہے کہ اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بہرحال اگر حکومت سمجھتی ہے کہ وہ خود ۴۵۰ روپے من کے حساب سے روئی خریدنے سے قاصر ہے تو یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ روئی کی برآمدی تجارت پر سے سرکاری اجارہ داری ختم کر کے نجی شعبہ کو روئی برآمد کرنے کی بلاتاخیر اجازت دی جائے۔

اس کے علاوہ ملک کی ٹیکسٹائل ملوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنی ضرورت کی روئی خرید کر لیں اور اس طرح ملکی ضرورت سے زائد روئی برآمد کرنے کی کھلی اجازت دے دی جائے۔

اگر کپاس کو بحران سے نکالنے کے فوری اقدامات نہ کئے گئے تو صرف متعلقہ افراد بحران کا شکار نہ ہوں گے، بلکہ یہ قومی زیاں بھی ہو گا جس سے کپاس کی آئندہ فصل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

اسی طرح چاول اور آلو کے کاشتکار بھی شدید مصائب سے دوچار ہیں۔ منڈی میں کساد بازاری کا دور دورہ ہے اور سرکاری خریداری بروقت نہیں ہو سکی جس کے نتیجہ میں فصل ضائع ہو رہی ہے اور قیمتیں غیر اقتصادی ہو گئی ہیں۔ مجلسِ شوریٰ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ کپاس کے ساتھ ساتھ چاول اور آلو کے ذخیروں کو تباہی سے بچانے کے لیے سرکاری خریداری اور برآمد کے لیے فوری اور مؤثر اقدامات کرے۔

عرب اسرائیل معاہدہ امن

امریکہ کے زیرِ اثر مصر اور اسرائیل کا حالیہ معاہدہ عربوں اور مسلمانوں کی جدید تاریخ کا المیہ ہے یہی وجہ ہے کہ عالم عرب نے اسے تقریباً بالاتفاق مسجدِ اقصیٰ کے تقدس اور مسلمانانِ فلسطین کے جائز حقوق کے ساتھ کھلی غداری قرار دیا ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ امن تو ارضِ فلسطین سے کچھ اور بھی دور ہو گیا ہے، لیکن عرب دنیا آپس میں بٹ گئی ہے اور اب اسرائیل کے مؤقف کی تائید کرنے والوں میں کچھ عربوں کے نام بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اپنی روح کے اعتبار سے یہ معاہدہ تاشقند اور شملہ کے معاہدات سے بھی بدتر ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں اسرائیل نے مصر کے کچھ علاقے کی واپسی کا وعدہ کر کے بقیہ تمام عرب علاقوں بشمول مسجدِ اقصیٰ پر اپنے ناجائز تسلط کے لیے مصر سے سندِ جواز حاصل کر لی ہے۔ اسرائیل کے اصل عزائم کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس معاہدے کے بعد اس نے ایک بار پھر یہ اعلان کیا ہے کہ اس کا دارالحکومت تل ابیب نہیں، بلکہ بیت المقدس ہو گا، درآنحالیکہ اقوام متحدہ کی قراردادوں میں بیت المقدس کے بارے میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ اس کی مشترکہ حیثیت کو ہرگز تبدیل نہ کیا جائے۔ اس اعلان کا صاف مطلب ہے کہ اسرائیل امریکہ کی پشت پناہی کے ساتھ بیت المقدس پر اپنے مخالفانہ قبضے کو دائمی شکل دینے کے مذموم منصوبے پر قائم ہے۔

مجلسِ شوریٰ اس امر پر اپنے گہرے غم اور افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ مصر کے موجودہ حکمران اسرائیل کے جال میں پھنس گئے ہیں اور نہ صرف مصر کو پورے عالمِ اسلام سے کاٹ دیا ہے بلکہ فی الحقیقت اسے عالمی صیہونی قوتوں کی سرائے بنا ڈالا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پہلی کارروائی یہ سامنے آئی ہے کہ مصر میں اسلامی قوتوں پر ضرب لگائی جا رہی ہے۔

عرب ممالک اور ایران نے اس معاہدے کے خلاف جو مؤقف اختیار کیا ہے مجلسِ شوریٰ اس کی تائید کرتی ہے اور یہ توقع رکھتی ہے کہ حکومت پاکستان بھی اسرائیل سے معاہدہ کرنے والی مصری حکومت سے کم از کم اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لے گی۔

مجلسِ شوریٰ مسلمانانِ عالم سے اپیل کرتی ہے کہ وہ قبلۂ اول کے مسئلے کی جانب پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوں اور حکومت پاکستان سمیت تمام مسلم ممالک سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی دینی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مل بیٹھ کر ایک متحدہ لائحہ عمل تیار کریں۔ طاقتور اور عیار دشمن کا مقابلہ اتحاد و یگانگت کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ اجلاس اپنے فلسطینی بھائیوں اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کی مکمل حمایت کا ایک بار پھر اعلان کرتا ہے اور اپنے فلسطینی اور عرب بھائیوں کو یقین دلاتا ہے کہ اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے وہ جو بھی جدوجہد کر رہے ہیں، اس میں انشاءاللہ وہ اہل پاکستان کو اپنے شانہ بشانہ پائیں گے۔

داخلی صورتِ حال کے بارے میں

جماعتِ اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس قومی اتحاد کے وزراء کی کارکردگی پر اپنے مکمل اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ اتحاد کے ان وزراء نے آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں شدید مشکلات، نامساعد حالات اور بے شمار موانع کے باوجود جس فرض شناسی، امانت داری، غیر جانبداری اور اہلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے وہ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔ مزید یہ کہ اپنے اہم مقاصد کے حصول کے بعد اتحاد کے فیصلہ کے مطابق تمام نمائندوں کی حکومت سے رضاکارانہ علیحدگی نے ملکی سیاست میں ایک نئی اور صحت مند روایت قائم کی ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اتحاد نے ملک کے وسیع تر مفاد میں حکومت میں جزوی شرکت چند متعین مقاصد کے حصول کے لیے کی تھی، وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اتحاد کا یہ فیصلہ بالکل درست اور

ملکی مفاد میں تھا۔ یہ اجلاس توقع رکھتا ہے کہ اتحاد کے وزراء نے اپنے محکموں میں جن دوررس اصلاحات کی ابتدا کی تھی ان پر عمل جاری رکھا جائے گا۔

یہ اجلاس اپنے اس موقف کا اعادہ کرتا ہے کہ آج ہمارا ملک جن بے شمار مسائل اور مصائب سے دوچار ہے انہیں صرف ایک منتخب حکومت بھرپور اعتماد کے ساتھ حل کرسکتی ہے اس لیے نومبر میں ہونے والے انتخابات سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور ملکی مفاد کا تقاضا ہے کہ انتخابات کی راہ کو ہرگز مسدود نہ ہونے دیا جائے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت ملک میں پائی جانے والی تلخیوں اور سیاسی جماعتوں کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی کے پیش نظر ایک عام شہری تذبذب اور عدم اطمینان کا شکار ہے اور انتخابات پر سے اس کا اعتماد مجروح ہوسکتا ہے۔ اس خوفناک صورتحال کو جلد از جلد تبدیل ہونا چاہیئے۔

سیاسی رہنما اور جماعتیں اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کرسکتیں کہ ایک جانب تو اندرون ملک عوام گرانی، بیروزگاری، رشوت، بدامنی کا شکار ہیں اور دوسری طرف بعض بڑی عالمی طاقتیں ایک مرتبہ پھر پاکستان کو دھمکیاں دینے پر اتری ہوئی ہیں۔ ایسے نازک دور میں آپس کی محاذ آرائی کسی کے حق میں بھی نہیں۔ اگر موجودہ تلخیوں کو کم نہ کیا گیا اور نفرتوں کی بڑھتی ہوئی خلیج کو پُر نہ کیا گیا تو پھر الیکشن کی راہ کھوٹی ہوسکتی ہے اس لیے اعلان شدہ پروگرام کے مطابق الیکشن کو یقینی بنانے کے لیے یہ اجلاس درج ذیل اقدامات کی سفارش کرتا ہے:

۱:۔ علیحدگی اختیار کرنے والی جماعتیں دوبارہ پاکستان قومی اتحاد میں واپس آجائیں کیونکہ ابھی وہ عظیم مقاصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوئے جن کے لیے یہ اتحاد وجود میں آیا تھا۔

۲:۔ تمام سیاسی جماعتیں اپنی انتخابی مہم میں مثبت رویہ اختیار کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ حریف اشخاص یا جماعتوں پر تنقید کرتے ہوئے دروغ گوئی، الزام تراشی اور بہتان طرازی کو روا نہیں رکھا جائے گا۔

۳:۔ سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندیاں ہٹائی جائیں لیکن ان سرگرمیوں کی آڑ میں کسی کو اس بات کی اجازت ہرگز نہ دی جائے کہ وہ پاکستان یا اسلام کی مخالفت کرے، عصبیتوں کو ہوا دے، نفرتوں کو ابھارے یا پھر ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرکے اسے گروہوں یا فرقوں میں تقسیم کرکے باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دے۔

۴:۔ بلدیاتی انتخابات ملکی انتخابات کے بعد کرائے جائیں۔

۵:۔ دستوری یا انتخابی معاملات میں سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لیے بغیر حکومت کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے اختلافی مسائل اٹھ کھڑے ہوں اور ملک کسی نئی الجھن میں مبتلا ہو جائے۔

۶:۔ ۱۲ ربیع الاول کو کی جانے والی اصلاحات پر پورے اخلاص کے ساتھ عمل کیا جائے تاکہ ذرائع ابلاغ اور تعلیمی اداروں کی نظریاتی پیش رفت جاری رہے اور عریانی، فحاشی اور طبقاتی اور گروہی منافرت کو ان اداروں میں گھسنے نہ دیا جائے۔ نیز اسلامی قانون، زکوٰۃ و عشر کے نظام اور غیر سودی بنکاری کو ان کے حقیقی روح کے مطابق نافذ کیا جائے تاکہ اس ملک کے عوام اسلام کی روحانی اخلاقی اور مادی برکات سے فیض یاب ہوسکیں اور بالآخر انہیں کفر، نفاق، ظلم، غربت، رشوت، چوری، بدامنی اور نوکر شاہی کی زیادتیوں سے نجات مل سکے اور ملت اسلامیہ پاکستان عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اپنی حقیقی منزل کی طرف بڑھ سکے۔

خارجہ امور کے بارے میں

مرکزی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس سینٹو سے پاکستان کی علیحدگی کے فیصلے پر حکومت کی مکمل تائید کرتا ہے۔ ایک اسلامی نظریاتی مملکت کی حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف ہم کسی بلاک سے منسلک ہوئے بغیر مثبت غیر جانبداری کی روش اختیار کریں تاکہ دنیا کے تمام مسائل پر حق و انصاف کے مطابق اور مظلوم کی حمایت میں ہماری آواز اٹھے اور دوسری طرف ہم مسلمان ممالک کے درمیان فکری، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی تعاون کو بڑھائیں تاکہ اسلامی دنیا ایک موثر عالمی قوت کی حیثیت سے ابھر سکے۔

سینٹو سے علیحدگی اس مثبت خارجہ پالیسی کی طرف ایک قدم ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ ہمارا دفتر خارجہ ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ایک واضح پالیسی مرتب کرے اور اس کے لیے نئے اقدامات کرے اور دوسری طرف تمام دنیا میں پاکستان کے سفارتی مشنوں کی اس طرح تطہیر کرے کہ وہ قومی آرزوئی اور امنگوں کے حقیقی ترجمان بن سکیں۔

ایٹمی پروگرام کے بارے میں

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتی ہے کہ وہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے پرامن مقاصد کی خاطر جوہری توانائی کی تیز تر ترقی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایک طرف تو امریکہ بھارت کو یورینیم فراہم کر رہا ہے جبکہ وہ ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے اور اب بھی کسی عالمی پڑتال سے انکاری ہے، لیکن پاکستان کے معاملہ میں جانبداری اور تعصب کا شکار ہو کر پاکستان کے بار بار اعلان کے باوجود کہ وہ جوہری توانائی صرف پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اُسے جوہری توانائی کی ترقی سے باز رکھنے کے لیے سیاسی اور معاشی دباؤ ڈال رہا ہے۔ امریکہ کا یہ رویہ نہایت افسوسناک ہے اور کوئی خوددار آزاد ملک اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

مجلس شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی امداد کو روک کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ معاشی امداد سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔ پاکستان کی خوددار قوم ہر اس امداد کو لعنت سمجھتی ہے جو اس کی آزادی اور نظریاتی تشخص کو متاثر کرنے والی ہو۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ناروا عالمی دباؤ اور بین الاقوامی صیہونی پریس کی ریشہ دوانیوں کو یکسر نظر انداز کر کے جوہری توانائی کی فراہمی کے لیے اپنی کوششیں تیز تر کر دے اور معیشت کو خود کفالت کی بنیاد پر منظم کرے۔

افغان مہاجرین کے بارے میں

مجلس شوریٰ افغانستان سے آئے ہوئے تباہ حال مہاجرین کے معاملہ میں بھی اپنے احساسات کا اظہار ضروری سمجھتی ہے۔ مسلمان ایک امت ہیں اور جہاں بھی اہل ایمان پر مظالم ہوں باقی دنیا کے مسلمان اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ آج افغانستان میں کیے جانے والے مظالم سے اپنی جان بچا کر آنے والے مہاجرین کا مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان کسی دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت کا تو حامی نہیں، لیکن ان مہاجرین کی امداد ہمارا انسانی اور دینی فریضہ ہے۔ ——— اس لیے یہ اجلاس حکومت کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ افغان مہاجر بھائیوں کی بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کے لیے برادر مسلم ممالک سے بھی تعاون حاصل کرے۔

مرکزی مجلس شوریٰ ہندوستان میں ہونے والے حالیہ مسلم کش فسادات پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتی ہے یہ المناک حقیقت ہے کہ آزادی کے اکتیس سالوں میں ہندوستان میں خون مسلم کی ارزانی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت جمشید پور میں جس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا کشت و خون ہوا ہے وہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہم حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرے اور لیاقت نہرو معاہدہ کی روشنی میں خود اپنا کردار ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔"

کون کہاں ہوگا، کس کے ساتھ ہوگا

انتخابات سے پہلے پاکستان کا سیاسی نقشہ کیا ہوگا؟

محبوب جاوید کا تجزیہ

ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی منظر سے ہٹ جانے کے بعد قومی سیاست میں نہایت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد حکومت سے نکل آیا ہے اور گذشتہ کئی ماہ سے اتحاد سے باہر پاکستان مسلم لیگ پگاڑا گروپ کو دوبارہ مسلم لیگ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پاکستان قومی اتحاد کے اربابِ بست وکشاد نے یہ فیصلہ "وسیع تر قومی مفاد" میں کیا۔ پاکستان مسلم لیگ چٹھہ گروپ نے پاکستان قومی اتحاد کا سامان پی ڈی پی ہاؤس میں منتقل کر کے مسلم لیگ ہاؤس پر اپنا قبضہ جما لیا ہے، گویا چٹھہ گروپ کے اربابِ اختیار نے پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اصلی مسلم لیگ پاکستان قومی اتحاد سے اب الگ ہوئی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے ان دونوں گروپوں میں کوئی نظریاتی یا اصولی اختلافات نہیں، اصل اختلافات پیر آف پگاڑا شریف اور ملک محمد قاسم کے درمیان ہیں اور یہ محض شخصی اختلاف ہے، لہٰذا عام خیال ہے کہ ملک محمد قاسم اور صاحبزادی محمودہ بیگم کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ چٹھہ گروپ کے دیگر اکابرین جن میں چوہدری ظہور الٰہی، میاں زاہد سرفراز، خواجہ محمد صفدر اور فدا محمد خان بھی شامل ہیں اور پاکستان مسلم لیگ کے عام کارکن بھی شاید جلد ہی پیر آف پگاڑا کی قیادت کو تسلیم کر لیں اور دوبارہ پاکستان قومی اتحاد میں شامل ہو جائیں۔

ملک محمد قاسم کو چونکہ خواجہ خیر الدین کی صورت میں اپنے گروپ کے لیے ایک صدر مل گیا ہے اور شعبہ خواتین کی چیف آرگنائزر پہلے ہی ان کے پاس موجود ہے لہٰذا پاکستان مسلم لیگ کے آنگن میں وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد قائم رکھیں گے، ممکن ہے وہ زیادہ بالغ نظری کا مظاہرہ کریں اور پاکستان مسلم لیگ کے تیسرے دھڑے کو ساتھ ملا لیں۔ ایسا اس لیے ناممکن نہیں کہ خان عبدالقیوم کو محض مسلم لیگ کا صدر کہلانے کا شوق ہے جبکہ ملک محمد قاسم کا شوق یہ ہے کہ وہ جنرل سیکرٹری رہ کر صدر کو اپنی انگلیوں پر نچائیں، لہٰذا مسلم لیگ کے قیوم خانی دھڑے اور قاسم گروپ میں مفاہمت کے امکانات موجود ہیں اور یہ اتحاد خواجہ خیر الدین کی برائے نام صدارت کی قربانی پر کسی وقت بھی معرضِ وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر قیوم لیگ اور قاسم گروپ میں اتحاد ہو جاتا ہے تو یہ بلاشبہ مسلم لیگ کا ایک مضبوط دھڑا ہوگا جس کو پاکستان قومی اتحاد سے باہر پاکستان تحریکِ استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان سے مل کر ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دینے کا موقع فراہم ہوگا۔ پاکستان قومی اتحاد سے تحریکِ استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کی علیحدگی بغیر کسی جواز اور اصول کے معرضِ عمل میں آئی تھی جبکہ این ڈی پی واحد سیاسی جماعت ہے جس نے پاکستان قومی اتحاد سے اصولی اختلاف کے باعث علیحدگی اختیار کی تھی۔ این ڈی پی کو پاکستان قومی اتحاد کی حکومت میں شمولیت سے اختلاف تھا، یہ اختلاف پی ڈی پی اور جمعیت علمائے اسلام کو بھی تھا مگر ان دونوں سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے "وسیع تر قومی مفاد" میں پاکستان مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے پیچھے حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اب جبکہ پاکستان قومی اتحاد حکومت سے باہر آ چکا ہے اور این ڈی پی کے بائیں بازو کا انتہا پسند ٹولہ این ڈی پی سے عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کی قیادت میں نکل چکا ہے، این ڈی پی کے رہنماؤں کے لیے پاکستان قومی اتحاد کے "وسیع تر" پلیٹ فارم پر سیاست کرنے کا موقع بھی ہے اور اس کے لیے اصولی جواز بھی موجود ہے، توقع ہے کہ خان عبدالولی خان اپنی قد آور سیاسی شخصیت کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کے پختون علاقے تک محدود کرنے کی بجائے قومی سیاست میں بھرپور اور شایانِ شان کردار ادا کرنے کے لیے این ڈی پی سمیت پاکستان قومی اتحاد میں واپس آ جائیں گے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس مرتبہ پاکستان قومی اتحاد کی قیادت کا قرعۂ فال بھی انہی کے نام نکلے۔

خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، پیر آف پگاڑا شریف، نوابزادہ نصر اللہ خان اور جماعت اسلامی کی قیادت پر مشتمل پاکستان قومی اتحاد کی قیادت چاروں صوبوں سے ہوگی اور بلاشبہ یہ قومی قیادت کہلائے گی۔ تحریک استقلال، جمعیت علمائے پاکستان، پروگریسو پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ کے باقی ماندہ عناصر پر مشتمل لبرل الائنس کی قیادت ایئر مارشل اصغر خان کے پاس ہوگی۔ جمعیت علمائے پاکستان کے عبدالستار نیازی اس الائنس کے سیکرٹری جنرل، خان عبدالقیوم خان یا خواجہ خیر الدین اس کے نائب صدر ہو سکتے ہیں۔

۱۷ نومبر ۱۹۷۹ء کو مجوزہ انتخابات کے پیشِ نظر بائیں بازو کے سیاسی عناصر جن میں این ڈی پی سے الگ ہونے والے بلوچ رہنما، معراج محمد خان کا قومی محاذ آزادی، مختار رانا کا انقلابی محاذ، خورشید حسن میر کی عوامی جمہوری پارٹی اور محمد حنیف رامے کی مساوات پارٹی، پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ بائیں بازو کا اتحاد بنا کر سابق وزیر اعظم بھٹو کے مداحوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ایوانِ اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کریں گے، اس سیاسی اتحاد کی قیادت بظاہر بھٹو خاندان کا کوئی فرد کرے گا جبکہ عملی طور پر اس کی قیادت پر انتہا پسند سوشلسٹوں اور علیحدگی پسندوں کا قبضہ ہونے کا احتمال ہے۔

موجودہ وفاقی وزیروں میں سے میر علی احمد تالپور اور جاوید ہاشمی ۱۳ مئی سے پہلے پہلے حکومت سے باہر آ جائیں گے اور خیال ہے یہ دونوں غیر جانبدار وزیر ملک کے نوجوان سیاست دانوں پر مشتمل ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ سندھ کا تالپور خاندان اور پنجاب میں پاکستان یوتھ فورس کے سابق عناصر این ڈی پی میں شامل ہو کر اس کو ایک علیحدہ سیاسی قوت کے طور پر انتخابی دنگل میں اترنے کے لیے تیار کر سکیں۔ بہرحال پاکستان کی قومی سیاست کے نقشے پر مستقبل قریب میں نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ تبدیلیاں متوقع ہیں، دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

لطیف خان

میں لاڑکانہ گیا، قبر پر فاتحہ پڑھی، لوگوں سے مِلا اور یہ مضمون لکھا

حیدرآباد سے دادو اور دادو سے لاڑکانہ کا سفر طویل تھا، لیکن آج کل سیاسی موضوعات اور گفتگو کے دائرے اتنے پھیلتے جا رہے ہیں کہ سفر کی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ بولان ایکسپریس کے اوقاتِ کار کچھ اس قسم کے ہیں کہ مجبوراً مجھے بس کی سواری کا انتخاب کرنا پڑا۔ گرمی شدید اور فضا میں حبس کی کیفیت تھی بس میں دادو روٹ پر مسافر اس طرح بھرے ہوتے ہیں جس طرح گائے بکریاں ٹرکوں میں لاد کر لائی جاتی ہیں پورے سفر میں مسافروں کی بات چیت کا اہم موضوع بھٹو رہا طالب علم ہوں یا ان پڑھ بوڑھے ہوں یا جوان سبھی بھٹو کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اداس لہجوں میں بھٹو کے متعلق ان کے تذکرے، آنکھوں میں سلگتی ہوئی محرومیوں، انہوں کی بے غیرتیوں کی داستانیں، سندھ میں قیادت کے فقدان کے مرثیے، بھٹو کے تختہ دار پر چڑھنے کی فرضی اور حقیقی کہانیاں پورے سفر میں ساتھ رہیں۔ میری سماعت لہجوں کے دکھوں کو شناخت کرتی رہی۔ ایک فرد کی موت پر ایسا ماتمی انداز، شاید "چشمِ سندھ" نے کبھی نہ دیکھا ہو۔

بس کے پہیے تارکول کی سپاٹ سڑک پر لپٹی ہوئی دھول کو اڑاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بھاگ رہے تھے اور میرے کان سیٹ کے پیچھے اور آگے بیٹھے ہوئے لوگوں کے غم زدہ جملوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا "بھٹو مر ہی نہیں سکتا، وہ زندہ ہے، اسے کون مار سکتا ہے" ایک نوجوان کا جذباتی اندازِ گفتگو بس کے انجن کے شور کو شکست دیتا ہوا اپنے ہم سفر سے مخاطب تھا "ہو سائیں بھٹو کو جنرل ضیاء نے نہیں ہم سندھیوں نے مارا ہے۔ آج ہم سب بھٹو کے لیے رو رہے ہیں، ڈیڑھ سال سے بھٹو پھانسی گھاٹ میں تھا۔ موت کی کوٹھڑی میں تھا اور ہم اس وقت کیا کر رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے قائد کہاں سو رہے تھے۔ ہماری قوم مردہ پرست قوم ہے۔ اب بھٹو کا مقبرہ بھی بنایا جائے گا، چہلم بھی ہوگا، برسی بھی ہوگی، لوگ فاتحہ خوانی کریں گے، وڈیرے قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے جائیں گے، بھٹو کی قبر کے مجاور بن کر ووٹ مانگیں گے اور پھر پرمٹوں اور لائسنسوں کا دھندہ شروع کر دیں گے۔ یہ قبر میں بھی بھٹو کو چین نہیں لینے دیں گے۔"

اس کا دوست کہہ رہا تھا: "بات تم نے ٹھیک کہی، لیکن یہ تو بتاؤ پیپلز پارٹی کے کارکن کب پیچھے رہے جب سے قائد عوام جیل گئے، وہ کوڑے کھاتے رہے، جیل جاتے رہے، ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ قصور تو ان وڈیروں کا ہے جو دورِ اقتدار میں تو اپنی تجوریاں بھرتے رہے اور دورِ ابتلاء میں مارشل لاء کے سامنے معافیاں مانگتے رہے اگر کارکنوں کو انتخابات میں لڑایا گیا تو ٹھیک، ورنہ وڈیرے پھر مسلط ہو جائیں گے۔ سندھی عوام بھٹو کی محبت میں وڈیروں کو منتخب نہ کرلیں، بس مجھے اس بات سے ڈر لگ رہا ہے، کیونکہ بھٹو کے نام پر ہی الیکشن جیتے جا سکتے ہیں، اسی لیے وڈیرہ ابھی تک پیپلز پارٹی سے چپٹا ہوا ہے۔"

ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے جو سندھی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، نوجوان سندھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا کہ وڈیروں کو گالی مت دو۔ وڈیرے سندھی قوم کا حصہ ہیں وڈیروں کی آڑ میں سندھیوں کو تقسیم کرنے کی سازش کی جارہی ہے تم لوگ اپنوں کے خلاف بول رہے ہو۔ غیروں کو دیکھو وہ بھٹو کے مرنے پر دیگیں پکا رہے ہیں" حیدرآباد میں جشن منایا جا رہا ہے۔ سنا ہے پورے شہر میں چراغاں ہے عید کا سماں ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ وڈیروں کے قصے چھوڑ دو۔ کیا بھٹو ہاری تھا؟ وہ خود بھی تو وڈیرا تھا۔ بھٹو کے لیے اب سندھیوں کے اعتماد کو قائم رکھنا چاہیے"۔

اس بزرگ کا لہجہ جارحانہ اور انداز میں ایسی سرکشی تھی کہ میں نے خاموشی کے تسلسل کو توڑا اور براہ راست گفتگو میں شریک ہو گیا۔

میں نے ان سے کہا کہ میں حیدرآباد سے آرہا ہوں" آپ بزرگ ہیں میں آپ کے بیٹے کی طرح ہوں، میری بات پر اعتماد کیجئے کہ حیدرآباد میں نہ جشن ہے نہ چراغاں، دیگیں بھی نہیں پک رہیں۔ یہ ضرور ہوا تھا کہ پھانسی کی خبر سن کر چند لوگوں نے مٹھائیاں تقسیم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن عام لوگوں اور میانوں نے انہیں منع کر دیا۔ بھٹو سے حیدرآباد والے اختلاف ضرور رکھتے تھے، لیکن اس کے انجام سے وہ خوش نہیں۔ یہ سب پروپیگنڈہ ہے۔ لوگ ہمیں آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے آنسوؤں کے "دریائے سندھ" بہائے ہیں تو شہروں میں بھی مہاجر طبقہ خصوصاً عورتیں افسردہ ہیں۔ بھٹو کی بعض مخالف عورتوں کے چولہے تک نہیں جلے۔ شدید مخالفوں کو بھی میں نے روتے دیکھا۔ آپ بزرگ ہیں، ایسی بات نہ کیجئے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما کرنے کے لیے غلط ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ خدارا ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، تو پھر کوئی ہمیں نہیں ملا سکے گا۔ بھٹو کے لیے آپ کے دکھوں کو ہم محسوس کرتے ہیں، لیکن ان دکھوں کی آڑ میں نفرتوں اور عصبیتوں کے کاروبار کو بند ہونا چاہیے"۔

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ بزرگ اور نوجوان میری گفتگو سے متفق ہوئے، بلکہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک کہا کہ "بابا آج اگر مہاجر بھٹو کے ساتھ ہوتے تو ہمیں یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔ ہماری قوم کے لیڈر ڈیڑھ سال تک خاموش رہے، ڈیڑھ سال تک تختہ دار سجا رہا۔ لیکن کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ بھٹو کو پھانسی سے بچالے۔ پورا سندھ قبرستان بنا رہا اور آج سب لوگ رو رہے ہیں مہاجروں میں اگر بھٹو پیدا ہوتا تو یہ قوم اس کا یہ انجام تو نہ ہونے دیتی۔

بزرگ بھی جو تھوڑی دیر پہلے زہر اگل رہے تھے، یوں گویا ہوئے: "سائیں ہم نے تقسیم دیکھی ہے، مہاجروں کو ہم نے اپنے دل و جگر میں پناہ دی ہے انہوں نے پاکستان بنایا ہے ہم نے تو قیام پاکستان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ۱۳ اگست کو سوئے اور ۱۴ اگست کو جاگے تو آزادی ہمیں مل گئی تھی، لیکن مہاجروں نے ہمیں کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ وہ سندھ میں رہتے ہیں، لیکن مفادات پنجاب سے وابستہ رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں قیادت کا بحران ہی اس لیے پیدا ہوا کہ سندھیوں اور مہاجروں میں اتحاد نہیں تھا۔ مہاجروں کا بھی ایک لیڈر تھا، لیاقت علی خان ہم اسے برا کہیں یا اچھا مہاجر اسے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں۔ لیاقت علی خان کو بھی راولپنڈی میں قتل کیا گیا اور ہمارے جگر گوشے بھٹو کو بھی راولپنڈی میں ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا یوں حساب برابر ہوا۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں ہمارے دکھوں کو کوئی محسوس نہیں کرتا ہم سندھیوں کو بزدلی اور کم ہمتی کے طعنے دیئے جا رہے ہیں۔ بنگالیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ انجام سب نے دیکھ لیا۔ اب آگے کیا ہوگا تصور کرتا ہوں تو میرا وجود تھرتھرا اٹھتا ہے"۔

بس سفر طے کر رہی تھی، جیسں بڑھ رہا تھا، گفتگو میں بھی اور ماحول میں بھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی ایک سندھی عورت بھٹو کی تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں محرومیوں کا زہر تھا، دریا خشک ہو چکا تھا، طغیانی کا وقت نکل چکا تھا۔

لاڑکانہ کا ایک نوجوان جو کراچی میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے، عیسائیوں کے مذہبی عقیدے سے متعلق ایک صلیب لیے ہوئے تھا جس پر حضرت عیسیٰ کی شبیہ آویزاں تھی۔ وہ اس صلیب کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے مخبوط الحواس گداگر کسی شے کو مستقل دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھی کو حضرت عیسیٰ کے سولی چڑھنے کے متعلق مسیحی عقیدے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ شاید اس پس منظر میں وہ دونوں بھٹو کے پھانسی پر چڑھنے کے واقعات کی فلم اپنے ذہنوں میں نقش کر رہے ہوں۔ دل میں آیا کہ کہوں سیاست میں اگر عقیدے داخل کئے گئے تو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا مزار اجڑ جائے گا، لیکن خاموش رہا، کیونکہ ہر انتہا پسند سندھی ہر مہاجر کو "دتارا مسیح" سمجھنے لگا ہے۔ وہ بھٹو کی پھانسی کا ذمہ دار مہاجروں کو ٹھہراتا ہے، لیکن اپنی اور بھٹو کی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ افسانوی ماحول میں بھٹو کی بہادری کے قصے نئی اور پرانی نسل کی رگوں میں منتقل کئے جا رہے ہیں تاکہ سندھی قوم کا سیاسی وابستگی کے بعد مذہبی اور روحانی تعلق بھی بھٹو سے وابستہ ہو جائے۔ ایک مرتبہ ایک قوم پرست نے مجھ سے کہا تھا کہ سندھی قوم میں کوئی ایسا شہید نہیں ہوا جسے ہم اپنا آئیڈیل بنائیں، لیکن بھٹو کی موت کے بعد اب یہ صورت نہیں رہی، پوری سندھی قوم کا آئیڈیل بھٹو بن چکا ہے۔ زندہ بھٹو سے مخالفت رکھنے والے سندھی بھی آنسوؤں کے دریا بہائیں گے۔ یہ بھٹو کو حضرت مسیح سے تشبیہ دے رہے ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ "جو مجھے چاہتے ہیں وہ اپنی خودی کا جذبہ ختم کر کے صلیبیں اٹھائیں اور میرے پیچھے ہولیں (متی ۲۴:۲۸)

جس وقت بس لاڑکانہ پہنچی تو سورج ادنگھ رہا تھا، فضا میں بھی لوگوں کی طرح گرمی تھی۔ اندرون سندھ سیاسی و جغرافیائی موسم اپنی انتہا کو چھو رہے ہیں۔ لاڑکانہ پیرس کی طرح خوبصورت نہیں، یہ فقط پروپیگنڈہ ہے۔ لاڑکانہ میں عام لوگوں کی گفتگو بھی سنی، ہوٹلوں میں بھی اجنبی کی طرح بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے والے نوجوانوں کے دلوں کا حال معلوم کیا۔ لاڑکانہ اداس ہے، یہاں کے شہری خاموش ہیں، دلوں کی کہانیوں کے افسردہ اوراق ان کے چہروں پر پڑھے جا سکتے ہیں، جب انسان اداس ہو تو ماحول بھی خود بخود اداس ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی دیار غیر سے آیا ہوا شخص اس افسردگی میں شامل نہ ہو تو پھر وہ ماحول سے قطعی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بوڑھوں کو دیکھا جن کے چہروں پہ جھریاں سجی ہوئی ہیں، جن کے کپڑے پھٹے ہوئے اور جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں، گلی میں ہوں یا بازار میں، ہوٹلوں میں ہوں یا سڑک پہ سفر کرتے ہوئے ان کی زبان پر ایک ہی نام ہے، نوجوانوں کے لہجے میں بغاوت کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ اگر ان کی باتیں توجہ و انہماک سے سنیں تو مستقبل دھندلا اور ہولناک نظر آتا ہے۔ میں نے ہوٹل میں ایک گاؤں سے آئے ہوئے سندھی سے پوچھا:

"کیا اب آپ کے علاقوں میں سکون ہے"! اس نے جس انداز میں مجھے دیکھا اس پر مجھے خود شرمندگی محسوس ہوئی۔ میرے چہرے کی تحریریں پڑھ کر اس نے فقط یہ کہا: "ہمارا سکون گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے"۔ مجھے اس کی آنکھیں "نیاگرا آبشار" کی طرح بہنے لگیں۔ ہچکیوں کے درمیان اس نے کہا: "میرے چار بیٹے غیرت و عزت کی جنگ میں مارے گئے۔ اب فقط ایک لڑکی زندہ ہے، لیکن مجھے بھٹو کے مرنے پر ایسا محسوس ہوا جیسے میں نامرد ہو گیا ہوں۔ میں ہی کیا، پورا سندھ بانجھ ہو گیا ہے، کون ہے جو ہمارے دکھوں کو دیکھے"۔

شدت جذبات کے یہ منظر لاڑکانے میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لگتا ہے کہ ہر آنکھ "دیدۂ یعقوب" بنی ہوئی ہے۔ خود شاید بھٹو کو بھی اس بات کا احساس نہیں ہوگا کہ سندھی اس سے کس درجے عقیدت رکھتے ہیں۔ جب ہی تو چھ سال کے دور اقتدار میں اسلام آباد میں سندھ ہاؤس تعمیر ہوتے رہے اور سندھ کے عام فرد کی خوشحالی کے لیے

اقدامات سے گریز کیا جاتا رہا، لیکن بھٹو کے دورِ اقتدار میں جو کچھ بھی ہوا ہو، سندھیوں کو بھٹو کی فقط اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ رہی بُرائیاں یا آمرانہ حکمت عملی تو وہ اسے جماعت اسلامی کا پروپیگنڈہ سمجھتے ہیں۔

"المرتضیٰ" کے سامنے میں نے کئی اشخاص کو زار وقطار روتے دیکھا۔ قدرت کی حاکمیت پر یقین کامل نہ کیا جائے تو پھر اسی قسم کے واقعات جنم لیتے ہیں۔ وہ "المرتضیٰ" جو کبھی ویران آبادی میں "تاج محل" کی طرح مرکزِ نگاہ بنا رہتا تھا، اداس مقبرے کی طرح تھا۔ میں نے لاڑکانہ سے ہی "المرتضیٰ" بات کرنے کی کوشش کی۔ "المرتضیٰ" کا ٹیلی فون ۳۲۸۵ ہے جو "ذوالفقار علی بھٹو بار ایٹ لاء" کے نام سے ہے۔ یہ ٹیلی فون اپنے مالک کی طرح خاموش تھا۔ کئی مرتبہ میری انگلیاں ڈائل گھماتی رہیں، لیکن کسی نے رسیور نہیں اٹھایا۔ شاید "المرتضیٰ" میں ملازمین کے علاوہ کوئی نہ ہو یا پھر ٹیلی فون کٹ چکا ہو۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو لندن میں ہیں۔ صنم بھٹو امریکہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو سہالہ میں نظر بند ہیں۔ خاندان کے دوسرے افراد دور دراز علاقوں سے تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں سے ملنے کی خاطر رتو ڈیرو اور گڑھی خدا بخش چلے گئے ہیں۔

میں نے لاڑکانہ میں چانڈ کا میڈیکل کالج کے چند طالب علموں سے بات کی۔ یہ طالب علم پیپلز پارٹی کے نظریات کے حامی اور بھٹو کی شخصیت کے پجاری تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ مہاجر بھٹو کو مارنا چاہتے تھے، وہ اب مرگیا ہے، لیکن بھٹو کی موت کا ردِ عمل مہاجروں کو کبھی نہ کبھی بھگتنا پڑے گا۔ پڑوس میں بھی موت ہو جائے اور چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اس کی موت کی خوشی میں مٹھائیاں تقسیم کرنا انسانیت نہیں۔ یہ سندھ کی روایات کے خلاف ہے اور ہم نے بھی اس روایت کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں نے بہت وضاحت کی کہ بھائی کہیں مٹھائی تقسیم نہیں ہوئی، بھٹو کی موت تو سب کے لیے عبرت کا مقام ہے۔ وہ نوجوان انتہائی طنزیہ انداز میں کہنے لگا کہ "عبرت کا مقام تو اب جلد آرہا ہے۔" میں نے کہا: "کیا وہ بھٹو کی موت کا غیر جذباتی تجزیہ کرنے کے لیے تیار ہے" تو وہ بولا: "آپ جذبات کو انسانوں سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے تمام جذبے بھٹو کے ساتھ ختم ہو چکے ہیں، لیکن ایک جذبہ زندہ ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سا جذبہ ہے۔"

میں نے کہا آپ کے خیال میں ذمہ دار کون ہے، جنرل ضیاء الحق جنھوں نے عدالتی فیصلے کی توثیق کی یا تارا مسیح جس نے بھٹو کی گردن کا منکا ایک جھٹکے میں توڑ دیا۔ یا وڈیرے اور لیڈر جنہوں نے پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں لوٹ مچائی اور جن کی بد اعمالیوں نے قرطاسِ ابیض چھپوائے، مگر جو بعد میں حکومت کے سامنے جھک گئے یا خود بھٹو کے اندر چھپا ہوا وہ زمیندار جس نے ذرا سی مخالفت برداشت کرنا بھی گوارا نہ کیا۔"

نوجوان میرے طویل سوال پر پہلے تو پریشان سا ہوا، پھر بولا ہم کس کو ذمہ دار سمجھتے ہیں، یہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔ ہمیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں"۔

اس طرح کے جذبات سندھ کے نوجوانوں میں عام ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بھٹو کے چہلم پر "شہباز قلندر" کے عرس سے زیادہ لوگ شریک ہوں گے اور اگر آئندہ انتخابات ہوئے تو ہم ثابت کریں گے کہ زندہ بھٹو سے جانے والا بھٹو زیادہ اکثریت سے کامیاب ہوگا۔

ایک منی بس کے ذریعے میں لاڑکانہ سے نوڈیرو پہنچا۔ لاڑکانہ سے نوڈیرو تقریباً ۱۳ میل ہے۔ نوڈیرو سے گڑھی خدا بخش کا فاصلہ دو میل ہے۔ گڑھی خدا بخش میں قبرستان کے قریب میلہ سا لگا رہتا ہے۔ سینکڑوں لوگ دور دراز علاقوں سے فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں۔ بھٹو کی قبر پر پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ تقریباً سات من پھول روزانہ چڑھائے جاتے ہیں۔ اگربتیوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ معمولی پھولوں کے ہار، پانچ روپے سے لے کر دس روپے تک میں فروخت کیے جا رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے پھولوں اور اگربتیوں کے لیے قبرستان سے قریب ہی دکانیں بنائی ہیں۔ بھٹو کی قبر قبرستان کی باؤنڈری کے بالکل قریب ہے۔ اس قبر کے ساتھ اُن کے سوتیلے بھائی امداد علی بھٹو اور والد شاہنواز بھٹو کی قبریں ہیں۔ قبرستان میں آجکل کم وبیش سارا دن قرآن خوانی ہوتی ہے۔ پہلے قرب وجوار کے دیہات میں رہنے والوں کو ہی قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لیے آنے دیا جاتا تھا، لیکن اب پابندی کسی حد تک نرم ہے۔ پولیس اور انتظامی مشینری کے حفاظتی انتظامات البتہ بدستور ہیں۔

قبرستان کے قریب میری ملاقات ایک ایسے مقامی شخص سے ہوئی جس نے بھٹو کی تجہیز وتکفین میں حصہ لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے ایک رشتہ دار کو بھی پھانسی ہوئی تھی۔ یہ غلط ہے کہ پھانسی لگنے کے بعد آنکھیں اور زبان باہر نکل جاتی ہے۔ اُس نے بتایا کہ گردن میں نرخرے کے پاس دو مختصر سے نشان پھانسی کے بعد ہو جاتے ہیں جیسے سانپ کے کاٹنے کے بعد ہوتے ہیں۔ یہ فقط پروپیگنڈہ ہے کہ بھٹو کو مارا گیا ہے۔ بھٹو ایک بہادر آدمی کی طرح پھانسی کے تختے پر پہنچا تھا۔ اگر بھٹو پر تشدد ہوتا تو لاش کبھی گڑھی خدا بخش کے زنان خانے میں ۴۵ منٹ نہ رکھی جاتی اور نہ چہرہ دکھایا جاتا۔ بلکہ اسے خاموشی سے دفن کر دیتے جیسا کہ انگریزوں نے پیر پگارو کو پھانسی دینے کے بعد نامعلوم مقام پر دفن کر دیا تھا۔

اس شخص نے یہ بھی بتایا کہ تدفین کی پوری فلم بنی ہے۔

بھٹو کا چہرہ معصوم تھا اور چہرے پر تشدد کی علامات نہیں تھیں۔ ان کی بیوی امیر بیگم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "مجرم کا چہرہ کیا ایسا پُرسکون ہوتا ہے"۔

قبرستان میں قبر پر فاتحہ کے بعد میں نے مقامی اشخاص سے باتیں کیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں بعض اوقات اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ ہمیں قطاریں لگانی پڑتی ہیں۔ لوگ بھٹو صاحب کی قبر پر اتنے آنسو بہاتے ہیں کہ قبر کی مٹی بھی گیلی ہو جاتی ہے۔

گڑھی خدا بخش سے نوڈیرو اور پھر نوڈیرو سے لاڑکانہ تک واپسی میں مجھے احساس ہوا کہ سیاست بھی مذہب کی طرح ایک طاقتور جذبہ ہے بشرطیکہ سیاست عوام میں نچلی سطح پر کی جائے۔ "بھٹو کی قبر" میرے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہے۔ جہاں اگر مقبرہ تعمیر ہوا تو پھر سندھیوں کی تمام روحانی اور سیاسی عقیدتیں اس مقبرے میں مرکوز ہو جائیں گی۔

بھٹو تو اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے البتہ پاکستان اپنی جگہ ہے اور یہاں کے عوام کو ابھی اپنی اپنی زندگی کے دن پورے کرنے ہیں۔ کاش بھٹو کی موت پر مٹھائی بانٹنے والے سوچیں کہ وہ مشتعل لوگوں کو کس قدر انگیخت کر رہے ہیں اور کاش بھٹو کے مداح بھی اس امر پر غور کریں کہ زندگی اور موت درحقیقت خدا کے اختیار میں ہے اور آج نہیں تو کل بھٹو کو بھی سب کی طرح اس دنیا سے جانا تھا، مگر جن حالات میں یہ دردناک موت ہوئی، اس میں کچھ حصہ ان کا اور ان کی پارٹی کا بھی تھا۔

کیا ہم کبھی جذبات کے اندھے پن سے باہر نکل کر بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں؟۔

اسی سوال میں پاکستان کے سیاسی مستقبل اور سندھ اور پنجاب کے باہمی متوقع تعلقات کا جواب پوشیدہ ہے۔

لاڑکانہ کا شہر افواہوں کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ لاڑکانہ بھٹو کا آبائی شہر ہے، یہاں کے رہنے والے بھٹو خاندان کے دکھ اور سکھ میں شریک رہے ہیں بھٹو کی پھانسی کے بعد یہاں افواہوں میں صداقت کے رنگ بھرے جا رہے ہیں جب حقیقتیں واضح نہ ہوں تو پھر افواہیں اپنی پوری شدت کے ساتھ ابھرتی ہیں اور بعض اوقات یہ افواہیں حقیقتوں کو بھی دھندلا کر دیتی ہیں۔ نفرتوں کی دھند میں عقیدتوں کے محراب تراشنے والے اپنے سیاسی مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے ہر محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔

لاڑکانہ میں یہ افواہ زور وشور سے اُڑائی گئی ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے سے قبل زدوکوب کیا گیا تھا اور وہ تختہ دار پر پہنچنے سے قبل ہی مر چکے تھے۔ وہاں اس نوعیت کی افواہ بھی زبان زدِ عام ہے کہ بھٹو کو پھانسی نہیں دی گئی، وہ لیبیا یا مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں محفوظ مقام پر زندہ سلامت موجود ہیں۔ انہیں لیبیا کے چارٹرڈ طیارے کے ذریعے پاکستان سے لے جایا گیا تھا اور ان کی جگہ بھٹو سے مشابہت رکھنے والے کسی اور شخص کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اس طرح کی افواہوں میں میک اپ کے لیے ہالی وڈ کے ایک ماہر کی پاکستان آمد اور رات کے وقت ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی منتقلی کے نام نہاد واقعات

بھی شامل کیے گئے ہیں۔

جب ان افواہ پھیلانے والوں سے بحث و تمحیص کی جاتی ہے اور ۳ اپریل کی نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے ذوالفقار علی بھٹو کی آخری ملاقات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ استدلال اختیار کرتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کے سربراہوں کی مداخلت سے حکومت پاکستان اور مارشل لاء حکام کے مابین معاہدہ ہوا تھا اور معاہدے کی رو سے حکومت پاکستان یا مارشل لاء حکام بھٹو کی جان بخشی کے لیے تیار ہو گئے لیکن ملکی صورتحال کا تقاضہ یہ تھا کہ اگر بھٹو کو علی الاعلان چھوڑ دیا جاتا تو بڑے پیمانے پر کشت و خون ہوتا اس لیے خاموشی اور رازداری کے ساتھ اس معاہدے پر عملدرآمد کیا گیا۔

افواہوں کے یہ حلقے اب فقط لاڑکانہ تک محدود نہیں رہے بلکہ پورے سندھ تک پھیل گئے ہیں۔ ان افواہوں میں بھٹو کے منظر عام پر آنے کے وقت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ عام انتخابات کے بعد عوامی نمائندوں کو منتقلی اقتدار کے بعد بھٹو اپنے وجود اور پھانسی گھاٹ سے منتقلی کے واقعات دنیا کے سامنے لائیں گے، لیکن معاہدے کے تحت وہ بیس سال تک پاکستان نہیں آسکیں گے، اس معاہدے پر عملدرآمد کی ذمہ داری چونکہ عرب رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے، اس لیے بھٹو عرب رہنماؤں سے کئے گئے اس عہد کی پابندی کریں گے۔

یہ افواہیں زیادہ تر پیپلز پارٹی کو زندہ رکھنے کے لیے اُڑائی جا رہی ہیں۔ ان افواہوں کا ایک مقصد سندھ کے سیدھے سادے اور خوش عقیدہ عوام پر بھٹو کے "مافوق الفطرت تشخص" کو قائم رکھنا ہے، کیونکہ اسی طرح ہی وہ آئندہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کو کامیاب کر سکتے ہیں۔

لاڑکانہ میں ایک افواہ یہ بھی سنی گئی ہے کہ بھٹو کی قبر میں چونا ڈالا گیا تاکہ لاش جلد از جلد سڑ جائے، اس طرح کی بے پر کی افواہیں اڑانے والے اپنی "غلطیوں اور کوتاہیوں" کو چھپانے کے لیے جھوٹ و دروغ گوئی کا سہارا لے رہے ہیں۔ ان افواہ طراز حلقوں کا پروپیگنڈہ انتہائی شدت کے ساتھ سندھ کے ہر کونے میں پھیلایا جا رہا ہے جبکہ شہروں میں بھٹو کی خودکشی کی مبینہ کوشش پر تبصرے کئے جا رہے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ بھٹو کے مرنے کے بعد جو لوگ سمجھتے تھے کہ جنرل ضیاء بین الاقوامی اپیلوں کو تسلیم کر کے بھٹو کی جان بخشی کر دیں گے، وہ اب افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ بھٹو مرا نہیں، بلکہ زندہ ہے وہ بھٹو کو روم کے دیوتا کا روپ دینا چاہتے ہیں جیسا کہ دیو مالائی داستانوں میں ہوتا ہے، لیکن کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے یہ ایک مشکل سوال ہے جس کا جواب آنے والا وقت دے گا، البتہ مرنے کے بعد سندھ میں بھٹو کی موت کو شہادت کا درجہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بھٹو کی قبر بھی کاروبار کا ذریعہ بن چکی ہے۔ سندھ کے مفلوک الحال روایت پرست عوام کو ایک "نئے مزار" پر حاضری دلانے کے لیے پیپلز پارٹی کے حامی سرگرم عمل ہیں۔ بھٹو کی قبر پر مجذوب قسم کے فقیروں نے بھی ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ دور دراز علاقوں سے گدا گر بھی وہاں پہنچ رہے ہیں، سیاہ پوش افراد بھی "نذرانہ" وصول کر رہے ہیں، اگر بتیاں مہنگے داموں بک رہی ہیں۔ "گڑھی خدا بخش" جانے کے لیے ٹرانسپورٹروں اور ٹیکسیوں نے بھی کرائے میں اضافہ کر دیا ہے۔ "شہید بادشاہ کے مزار پر چلو" کا نعرہ لگانے والے دور دراز علاقوں سے آنے والوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں، قبر کے اطراف کی مٹی شیشیوں میں بیچی جا رہی ہے، قبر پر چادریں چڑھائی گئیں اور نیازیں مانگی جا رہی ہیں۔ اس مزار کا ماحول بھی پاکستان کے دوسرے بزرگوں کے مزاروں کی طرح بنا دیا گیا ہے۔

یہاں کہا جا رہا ہے کہ چہلم کے روز پورے ملک سے دس لاکھ افراد گڑھی خدا بخش آئیں گے اور مزار پر حاضری دیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قبرستان کے قرب و جوار کا علاقہ بھٹو کے مقبرے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ رتوڈیرو کے مقامی لوگوں کے مطابق بھٹو کی پھانسی سے قبل برٹش ٹیلی ویژن کی ایک ٹیم یہاں آئی تھی جس نے مقامی لوگوں اور کارکنوں سے رابطہ قائم کیا تھا، چار رکنی ٹی وی ٹیم میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ اس ٹیم نے نوڈیرو میں بھٹو خاندان کے مکانات اور گڑھی خدا بخش بھٹو کے قبرستان کی بھی تصویریں اتاری تھیں، لاڑکانہ میں اس ٹیم نے "المرتضیٰ" کی بھی فلمبندی کی تھی، برطانوی ٹیم آٹھ گھنٹے تک ضلع لاڑکانہ میں رہنے کے بعد بذریعہ طیارہ واپس کراچی چلی گئی تھی۔ اس طرح برطانوی ٹیلی ویژن کو گڑھی خدا بخش کے قبرستان کی سب سے پہلے فلمبندی کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ دیکھیں برطانوی ٹیلی ویژن ادارہ کب اس فلم کی نمائش کرتا ہے۔

ماہنامہ عقاب کراچی

مشینی انڈوں کی لذیت مشکوک ہے ان کا کھانا جائز نہیں؟

ایک انتہائی اہم اور دلچسپ مسئلہ

سب رنگ والی انکا اب کہاں ہے

انکا کے مالک کا پہلا باتصویر انٹرویو

پھانسی کے بعد بھٹو کے چاہنے والے

پیر پگارا ● نورانی میاں ● حنیف رامے ● معراج محمد خان
حفیظ پیرزادہ ● مشیر پیش امام ● بزنجو ● مینگل ● رفیق باجوہ اور
دیگر رہنماؤں سے بھٹو کے بارے میں گفتگو

شرمیلا عمران خان اور کرکٹ

رنگین تصویروں کے ساتھ

کیا بابرا اور ندیم کا معاشقہ اب بھی چل رہا ہے

آگہی فلاپ کیوں ہے؟

مشتاق محمد کا انٹرویو

اور دیگر بہت سے دلچسپ

فیچروں کے ساتھ مئی کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

قیمت صرف سات روپے

نفرت اور باہمی خلیجیں پوری قوم کو لے ڈوبیں گی۔

دائیں اور بائیں بازو کو ملکر پاکستان کو بچانا ہوگا

لطیف خان کا تجزیہ

پاکستان کی سیاست ہمیشہ نظریاتی طور پر تقسیم رہی ہے۔ ایک گروپ دائیں بازو اور دوسرا بائیں بازو کے نام سے موسوم ہے۔ دائیں بازو کے حامی مذہب پرست، روایات کے حامی اور اقتصادیات کے شعبے میں کسی قسم کی بڑی انقلابی تبدیلی کے مخالف بتلائے جاتے ہیں جبکہ بائیں بازو سے منسلک افراد قدامت پرستی کے مخالف اور سوشلزم کی حمایت کرتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں اس قسم کی نظریاتی تقسیم موجود ہے اور پاکستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن ہمارے یہاں نظریاتی اختلافات پر مبنی سیاست توازن اور اعتدال سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ نظریاتی موضوعات پر بحث و مباحثہ مفقود، لیکن سر پھٹول، ہنگامہ آرائی، اور تشدد پسندی کی فراوانی ہے۔ نظریاتی مخالفوں کے مابین دشمنیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ جس طرح دائیں بازو کے حامیوں میں مختلف گروپ ہیں، بالکل اسی طرح بایاں بازو بھی کئی دھڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ دائیں بازو کی حامی سیاسی جماعتیں اور ان کے ترجمان اخبارات بائیں بازو پر "ملک دشمنی" "غداری" اور "قوم فروشی" کے الزامات عائد کرتے ہیں جبکہ بایاں بازو ان کو "رجعت پسند" "سامراجیوں کے ایجنٹ" اور "محنت کش انقلاب کے مخالف" گردانتا ہے۔ دونوں گروپوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں، اس لیے دونوں گروپوں کے ہمنوا اس نظریاتی کشمکش میں اپنے اپنے نکتۂ نظر کے حامی ہوتے جارہے ہیں۔ کسی ترقی پذیر ملک میں اقتصادی نظریات کی بنیاد پر سیاسی تقسیم منفی طرزِ عمل نہیں۔ اقتصادیات کے شعبے میں تبدیلیاں دونوں فریقین چاہتے ہیں۔ فقط طریقۂ کار اور حکمتِ عملی کا اختلاف ہے۔ بائیں بازو کی اکثریت مذہب پر یقین رکھتی ہے، لیکن وہ مذہب کی آڑ میں، اوہام، رسوم اور اس نوعیت کی فروعات کی مخالف ہے، اس کے برعکس دائیں بازو کی سیاست کرنے والے زمینی حقائق اور معاشی عمل کے ارتقائی عہد کو نظر انداز کر کے ابھی تک آسمانی سیاست پر یقین رکھے ہوتے ہیں۔ بائیں بازو والے بھی دائیں بازو کی تقلید میں ابھی تک نعرے بازی، نظریاتی مباحث اور مارکس کی تھیوریوں کی تشریح و توضیح میں مصروف ہیں۔

ان دونوں گروپوں کی سیاست اور باہمی اختلاف سے ایک عنصر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ عنصر "ان نام نہاد سوشلسٹوں" کا ہے جنہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بدترین آمریت قائم کی تھی۔ یہ نام نہاد سوشلسٹ بہروپیئے، ترقی پسند معاشی نظام کی آڑ میں ۱۹۷۰ء کی انتخابی کامیابی کے بعد اقتدار پر قابض ہو کر پورے ملک کو "نازی کیمپ" میں تبدیل کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بائیں بازو کی تمام جماعتوں اور حامیوں نے پیپلز پارٹی کو کامیاب کرایا تھا۔ کارخانوں، تعلیمی اداروں، اخباری دفاتر، ادیبوں، دانشوروں اور کسانوں میں بائیں بازو کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بائیں بازو والے قلیل ضرور ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی جارحانہ حکمتِ عملی، جدید سیاسی انداز اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کے گر دائیں بازو کی جماعتوں کو پسپا کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

ہم دیانتدارانہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ بائیں بازو کے حامیوں اور دائیں بازو کے علمبرداروں کے مابین اختلافات فقط نظریات تک محدود ہونے چاہئیں۔ قومی نکتۂ نظر اور قومی مفادات کے وقت ان دونوں گروپوں کو ملکی استحکام اور سالمیت کو پیشِ نظر رکھنے کے لیے متحد رہنا چاہیئے جیسا کہ بھٹو کے خلاف عوامی تحریک کے دوران ہوا اور پوری قوم نظریاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے ریاستی عشیزی کے استبداد کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔

بہروپیئے سوشلسٹ اُس وقت جے اے رحیم، مختار رانا میجر اسحٰق محمد، سی آر اسلم، معراج محمد خان، سید سعید حسن اور بائیں بازو کے دیگر مقتدر قائدین کے خلاف پوری طاقت سے سرگرمِ عمل تھے۔ یہ جعلی سوشلسٹ اب اپنے قائد کی غیر طبعی موت سے فائدہ اٹھانے کے لیے دوبارہ بائیں بازو کے کیمپ میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قابلِ افسوس بات یہ ہے بائیں بازو کی سیاست میں ان لوگوں کو لانے والے معراج محمد خان، خورشید حسن میر اور منہاج برنا جیسے لوگ ہیں جنہوں نے بھٹو کے آمرانہ اقتدار میں خود بے پناہ مظالم برداشت کیے تھے۔ معراج محمد خان جیسے مخلص اور دیانتدار شخص کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اُس وقت منہاج برنا بھائی کی "آنکھوں کی بینائی" کھو جانے کے خوف سے اپنی ذات میں سکڑ گئے تھے۔ اُن کے لہجے میں تلخی اور سختی قابلِ فہم بات تھی۔ آمریت کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا تو اس وقت بائیں بازو اور دائیں بازو کے تمام افراد مل کر ظلم کے درخت کو ہمیشہ کے لیے اکھیڑنے کے لیے جدوجہد کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ نظریاتی اختلافات آمریت کے خلاف تحریک کے وقت ختم ہو چکے تھے۔ آج پھر وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ بائیں بازو کے حامی اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا تعین کریں۔ وہ جعلی سوشلسٹوں کی "بیساکھیوں" کا کردار ادا نہ کریں۔ جماعت اسلامی کی مخالفت میں پیپلز پارٹی سے الفت اور راہ و رسم بڑھانا مثبت اندازِ فکر نہیں۔ یہ امر قابلِ فہم ہے کہ جماعت اسلامی نے نظریاتی مہم جوئی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ جماعت اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے بائیں بازو کے خلاف معاندانہ اور ظالمانہ پروپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ بدقسمتی سے یہ جماعت دائیں بازو کے حامیوں کی سرخیل بن گئی ہے جبکہ دائیں بازو کے حامیوں کی اکثریت جماعت اسلامی کے فسطائی طریقہ کار کی مخالف ہے، اس لیے بائیں بازو کے حامیوں کو بھی دائیں بازو کے خلاف "چھاپہ مار جنگ" جاری نہیں رکھنی چاہیئے، کیونکہ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہماری سرحدوں پر "آتش فشاں" پھٹ رہے ہیں۔ اقتصادیات کا شعبہ ترقی نہیں کر سکا ہے۔ چاروں صوبوں میں خودمختاری کی آڑ میں گندے کھیل کھیلے جارہے ہیں۔ عام انتخابات کی تاریخ نزدیک تر آتی جارہی ہے۔ اور آپسی سیاسی و نظریاتی اختلافات کے "پنڈورا بکس" کھولے جارہے ہیں۔ ایک آمر کی قبر کے مجاور دوبارہ اقتدار پر قابض ہونے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

جس طرح دائیں بازو کے حامی محبِ وطن ہیں، بائیں بازو کے نکتۂ نظر رکھنے والے بھی پاکستان سے محبت رکھتے ہیں۔

دونوں بازوؤں کی حمایت کرنے والے لوگوں کا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ آئندہ عام انتخابات میں پروگرام کی بنیاد پر انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ شخصیت پرستی کا "سیزن" ختم ہو جانا چاہیئے۔ بائیں بازو کے حامی بھی دائیں بازو کی طرح کئی حصوں میں تقسیم ہیں۔ ان کے مابین ذاتی اختلافات نے "نظریاتی اختلاف" کا رُخ اختیار کر لیا ہے جبکہ پیپلز پارٹی دونوں "بازوؤں" پر سوار ہو کر اقتدار کے لیے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ دائیں بازو کے حامی آئندہ عام انتخابات میں متحد نہ ہوئے تو یہ الم نشرح حقیقت ہے کہ انہیں ۱۹۷۰ء سے زیادہ انتخابی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ بائیں بازو کے حامیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت اور وزن کو کسی ایک سیاسی قالب میں منتقل نہ کیا تو پھر "جعلی سوشلسٹ" کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بہروپیئے سوشلسٹ نہ اسلام سے محبت رکھتے ہیں اور نہ انہیں سوشلزم سے کوئی دلچسپی ہے۔ بڑے بڑے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے وڈیرے عالیشان کوٹھیوں میں مقیم، جاگیر دار، سرمایہ دار، نو دولتے معاشی لٹیرے، دائیں اور بائیں بازو کے درمیان کشمکش تیز تر کرنے اور اقتدار پر قبضہ کر کے "انتقام کے شعلے" ملک کے قریہ قریہ میں بھڑکانے کے لیے سوچ بچار کر رہے ہیں۔ یہ وقت کا "عظیم المیہ" ہے۔ اعتماد کا بحران اگر فریقین میں ختم نہ ہوا تو پھر بائیں بازو اور دائیں بازو والے سُن لیں کہ نوشتۂ دیوار پر کیا لکھا ہے۔ معراج محمد خان کی آنکھیں پہلے تو سلامت رہ گئی تھیں، اب یہ بھیڑیے آئے تو "ممتاز بھٹو" اور "حفیظ پیرزادہ" تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کہ مضبوط سیاسی مخالفت کا تصور اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ میاں طفیل بھی کان کھول کر اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھ لیں کہ "جسارت" کے اداریے ملک کی سیاست کے نباض نہیں۔ انتقامی بلیاکھیوں کا سہارا لینے والی سیاست پاکستان میں نہیں چل سکتی۔ "ملک دشمنوں" اور "غداریوں" کے سرٹیفکیٹ تقسیم کرنا چھوڑ دیجیے، ورنہ اکتوبر میں ایسا حشر اُٹھے گا کہ قیامت آ جائے گی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے سبق حاصل کیجیے، دگرنہ تاریخ کا فیصلہ قوم کے مستقبل کو تاریکیوں میں بھی پھینک سکتا ہے۔ بائیں بازو والو، دائیں بازو والو، دیکھو بہروپیئے، سازشیے، سیاسی لفنگے، آمر کی قبر کی پوجا کرنے والے تم دونوں کو لوٹنے آ رہے ہیں۔ سنبھل جاؤ، متحد ہو جاؤ، وگرنہ اس بار آمریت قائم ہو گئی تو کوئی مارشل لا تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ "گڑھی خدا بخش کے مُردے" میں روح پھونکنے والو، یہ مُردہ زندہ ہوا تو ملک بھر قبرستان بن جائے گا، کیونکہ انتقام در انتقام کی فضا میں ملک نہ بچ سکے گا۔ نظریے کی بات کرو، شخصیت کے حصار سے نکلو۔ یہی ملک کو بچانے اور چلانے کا واحد راستہ ہے۔

کشمیر

اس مظلوم حریت پسند کی بھی سنیئے

کلیم عباسی

کیا آپ چند لمحے کے لیے وقت نکال کر ایک مظلوم کی داستانِ غم سننا پسند کریں گے۔

یہ کیس جو ظلم و زیادتی کا دوسرا نام ہے، ممتاز کشمیری حریت پسند اور بھارتی جہاز "گنگا" کے ہائی جیکر مسٹر ہاشم قریشی کا ہے۔

ہاشم قریشی وہ کشمیری حریت پسند ہے جس نے اپنے ایک ساتھی اشرف قریشی کے ساتھ ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک بھارتی طیارہ "گنگا" اغوا کر کے عالمی دنیا میں کشمیری قوم کی حیثیت منوائی تھی، لیکن آج وہی ہاشم قریشی اس "جرم" کی پاداش میں سنٹرل جیل فیصل آباد کی "سی" کلاس میں چودہ سالہ قید کاٹ رہا ہے۔

ہاشم قریشی اور اس کے دوسرے ساتھی کو اس وقت کی یحییٰ حکومت نے بھارتی ایجنٹ قرار دیکر گرفتار کیا۔ یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کی صورتِ حال حد سے زیادہ بگڑ جانے کی اصل وجوہات یعنی اپنی نااہلیت، مجرمانہ غفلت، اقتدار پرستی، ہوس رانی و کوتاہ اندیشی کو چھپا کر اور عوام کی توجہ اس سے ہٹا کر اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ سنسنی خیز شوشہ اختراع کیا اور اس المیہ کی ذمہ داری بھارتی طیارہ اغوا کرنے والے کشمیری نوجوانوں پر عائد کر دی۔

بھارتی طیارے کا اغوا اور اسے نذرِ آتش کرانا کشمیریوں کی بھارت کے ساتھ سازش کا نتیجہ تھا یا بھارت کی کشمیری قوم پر ظلم و جبر کا نتیجہ۔ وہ کشمیری نوجوان جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا جذبۂ حریت کے تحت کام کر رہے تھے یا بھارت سرکار کے ایما پر، قومی محاذِ آزادی کی سرگرمیاں بھارت نوازی پر مبنی تھیں یا مقبوضہ کشمیر پر بھارت کے جارحانہ تسلّط کے خلاف اقوامِ عالم کے ضمیر کو بیدار کرنے اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ان تمام سوالوں کا جواب وقت ہی دے گا۔

سرِدست یہ حقیقت واضح کرنا ضروری ہے کہ اس دور کی حکومت کے ایک حکم نامے کے تحت سپیشل کورٹ کا تقرر عمل میں لایا گیا اور ان دو کشمیری حریت پسندوں پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا۔ اس سپیشل کورٹ نے ہاشم قریشی کو ۱۴ سالہ قید کی سزا سنائی اور اس کے دوسرے ساتھی اشرف کو بری کر دیا۔ اشرف کو کیوں بری کیا گیا اور ہاشم کو کیونکر سزا سنائی گئی، حالانکہ جہاز دونوں نے مل کر اغوا کیا تھا، یہ اپنی جگہ سوچنے والی بات ہے۔

تقریباً ایک سال قید کاٹنے کے بعد ہاشم قریشی کو بھٹو حکومت نے شملہ معاہدہ کے تحت بھارت کے حوالے کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ساہیوال جیل سے کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا گیا، لیکن ہاشم قریشی نے اس فیصلے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی اور جسٹس مولوی مشتاق حسین کی عدالت نے حکم امتناعی جاری کر کے اس کشمیری حریت پسند کو بھارتی درندوں سے بچایا۔

بہر حال بھٹو صاحب گزر گئے اور مکافاتِ عمل نے ان کو گھیر لیا، مگر ان کے جانے کے بعد بیوروکریسی ہاشم کو "بھارتی شہری" قرار دے رہی ہے۔ اب جبکہ ظلم و جبر کا دور ختم ہو چکا ہے، پاکستان میں ہر کسی کے ساتھ انصاف کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں، سابق حکومت کے دور میں ذاتی رنجش اور سیاسی مقاصد کی خاطر جیل جانے والے افراد رہا کیے جا چکے ہیں، حیدر آباد اور اٹک سازش کیس کو نام نہاد قرار دیا جا رہا ہے، لیکن ہاشم کو انصاف نہیں ملا۔ کیا اس کیس کا ازسرِنو جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ گنگا کیس تمام دوسرے نام نہاد مقدمات سے زیادہ فراڈ اور نام نہاد ہوگا۔

قومی اتحاد کے ایک سابق وزیر چوہدری ظہور الٰہی نے ۲۷ جنوری ۱۹۷۹ء کو لاہور میں کشمیری مہاجرین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے برملا کہا تھا کہ "بھٹو حکومت نے چند مخصوص مفادات اور مقاصد کی خاطر کشمیری حریت پسندوں کو جیل میں رکھا"۔ چوہدری صاحب نے واضح کیا تھا کہ "گنگا کیس فراڈ ہے اور ہاشم قریشی بے قصور اور بے گناہ ہے اور اُسے بہت جلد رہا کر دیا جائے گا"۔ لیکن ان تمام یقین دہانیوں کے باوجود ہاشم ابھی تک جیل میں ہے اور اس پر آج بھی ظلم ہو رہا ہے۔ کیا اُسے ایک کشمیری حریت پسند اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا ایک عظیم جانباز ہونے کی "سزا" مل رہی ہے۔ ستم یہ ہے کہ ہاشم نے سزا کے خلاف مئی ۱۹۷۳ء میں اپیل دائر کی تھی، لیکن چھ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی اپیل کی سماعت نہیں ہو سکی اور اس کو وکیل نہیں دیا گیا۔

جنابِ والا! کیا اہلِ شعور و دانش پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ ایک بے گناہ، بے قصور اور جذبۂ آزادی سے سرشار کشمیری حریت پسند کی آواز کو اہلِ اقتدار کے گوش گزار کریں اور انہیں مجبور کریں کہ اس عظیم مجاہد کو بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انصاف فراہم کیا جائے۔

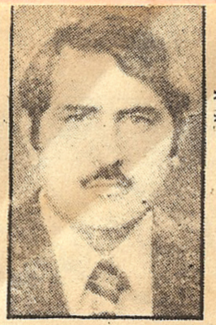

محمد شبیر شیخ

تحریکِ استقلال کے ظفر علی شاہ کہتے ہیں:

ایک ہی لیڈر۔ اصغر خان۔ ایک ہی جماعت۔ تحریک

سید ظفر علی شاہ صاحب تحریکِ استقلال کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ۷۷ء کے الیکشن میں راولپنڈی سے قومی اتحاد کی طرف سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار بھی تھے۔ وہ تحریکِ استقلال پنڈی کے سابق صدر ہونے کے علاوہ راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر اور پنجاب بار کونسل کے رکن بھی ہیں۔ ان سے چند سوال ملاحظہ ہوں:

س:۔ تحریکِ استقلال کے آئندہ پروگرام کے متعلق کچھ بتائیے؟

ج:۔ اس وقت ملک میں صرف ایک جماعت تحریکِ استقلال ہے جو ترقی پسندانہ پروگرام رکھتی ہے۔ اسے جو قیادت ملی ہے، وہ مخلص، بے لوث اور نڈر ہے۔ اصغر خان واحد سیاسی راہنما ہیں جو دور دراز علاقوں کا دورہ کر کے عوام کی مشکلات کا جائزہ لینے کے بعد انہیں حل کرنے کی تجاویز بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری سیاسی جماعتوں کی حالت ہمارے سامنے ہے، جو جماعت اپنے اندرونی مسائل خود حل نہ کر سکے، وہ ملکی مسائل کو حل کرنے کی بجائے اس میں اضافہ کرے گی۔ مسلم لیگ کو دیکھ لیں، اس کے تین دھڑے بن چکے ہیں۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بھی انتشار کا شکار ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں کوثر نیازی نے اپنا الگ گروپ بنایا ہے یعنی ہر طرف انتشار ہے۔ میرے اپنے خیال میں یہ انتشار منطقی بھی ہے، کیونکہ ان جماعتوں کی قیادت نہ صرف جاگیردارانہ ذہنیت رکھتی ہے بلکہ ان کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ رہی جماعتِ اسلامی تو یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ اسے پورے پاکستان میں صرف ۲۰۰۰ لوگ مسلمان نظر آتے ہیں جو اس کے رکن ہیں۔ ویسے بھی جماعت اسلامی نے تعصب کی وہ عینک پہن رکھی ہے جس میں انہیں نہ تو عورت کی مظلومیت نظر آتی ہے نہ مزدور کا پسینہ اور نہ کسان کی محنت۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہندوستان کی جن سنگھ اور جماعت اسلامی میں کوئی فرق نہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

ہماری جماعت فرقہ واریت سے ہٹ کر ملک کے مظلوم طبقے کی نمائندگی کر رہی ہے۔ ہم بے ایمانی اور جھوٹ کی سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔

س:۔ آج کل آئین میں ترامیم کا ذکر عام ہے۔ آپ کی جماعت کا اس بارے میں کیا موقف ہے؟

ج:۔ فوجی حکومت پہلے ہی آئین میں جو ترامیم کر چکی ہے ان کا کوئی جواز نہیں تھا، لیکن اگر "نظریہ ضرورت" کے تحت یہ جواز تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے سراسر خلاف ہوں، کیونکہ نہ یہ ملکی سیاست کے لیے مفید ہے اور نہ خود فوج کے ادارے کے لیے صحت مند۔ اس سے پہلے پاکستان کے کسی آئین میں فوج کے متعلق کوئی شق نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چار سال کے بعد فوج نے اپنا "کردار" ادا کیا۔ اگر اس کردار کی اجازت آئین میں دے دی گئی تو یہ ملک نہ صرف سازشوں کا بلکہ عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ فوج کو پارلیمنٹ اور عوامی اداروں سے جتنا دور رکھا جائے اتنا ہی ملک، فوج اور عوام کے لیے بہتر ہوگا۔

س:۔ آپ کے خیال میں قومی اتحاد نے حکومت سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟

ج:۔ میرے خیال میں فوجی حکومت نے قومی اتحاد کے نادان ٹولے کو اچھی طرح استعمال کر لیا تھا اور اب جنرل ضیاء صاحب ان کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہتے تھے جو استعمال شدہ چیز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے قومی اتحاد کے وزراء کی بہت عزت رکھی اور ان کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ یہ بات کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ بھٹو کے پھانسی لگنے کے بعد فوجی حکومت اور قومی اتحاد کی مشترکہ حکومت کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قومی اتحاد حکومت میں رہنے کے باوجود عوام کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا اور ان مسائل میں اضافہ کر دیا۔ ان تمام چیزوں کا واحد حل نمائندہ حکومت میں ہے اور انتخابات کے ذریعے منتخب ہونے والی حکومت ہی عوام کے مسائل کا اندازہ کر سکتی ہے، لہٰذا قومی اتحاد نے اپنی ناکامی کا احساس کرتے ہوئے الگ ہونا اور الگ ہو کر انتخاب لڑنا پسند کیا۔

س:۔ کیا آپ عام انتخابات سے پہلے بلدیاتی انتخابات کے حق میں ہیں؟

ج:۔ بلدیاتی انتخابات عام انتخابات کے بعد ہونے چاہئیں اور یہ مسئلہ آئندہ آنے والی حکومت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی ہم سب کے مفاد میں ہے کہ اسی سے ملک کی اندرونی حالت مضبوط رہ سکتی ہے کیونکہ اس وقت ساری اہمیت عام انتخابات کی ہے اور پوری قوم اور سیاسی جماعتیں اس پر متفق ہیں، لہٰذا ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس کی وجہ سے سیاسی پارٹیوں کے مابین محاذ آرائی شروع ہو جائے۔ عام انتخابات پر تمام پارٹیاں متفق ہیں اور بلدیاتی انتخابات کے لیے سب پارٹیاں متفق نہیں، لہٰذا اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے، اکثریت عام انتخابات چاہتی ہے نہ کہ بلدیاتی، اس لیے ہمیں توقع ہے کہ حکومت ایسی حالت پیدا ہونے نہیں دے گی جس کی وجہ سے قوم مایوسی کا شکار ہو یا حکومت پر اعتماد مجروح ہو جائے۔

ظفر علی شاہ صاحب نے ہمارے اس سوال پر کہ موجودہ سیاسی جماعتیں کس طرح عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں، کیونکہ انہیں انتخاب لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا اور بقول آپ کے جو انتخاب لڑا گیا وہ دھاندلی پر مبنی تھا، یہ کہا کہ ہم عوام کی نمائندہ سیاسی جماعتیں ہیں، کیونکہ سبھی میدان میں موجود ہیں اور ہم سب کی سب بلدیاتی انتخابات کرانے کی مخالف ہیں، لہٰذا یہ انتخابات نہیں ہونے دیئے جائیں گے۔

اس سوال کے جواب میں کہ عوام کو نچلی سطح پر اقتدار منتقل کرنے سے جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی سیاسی جماعتوں کو کیا اعتراض ہے، انہوں نے کہا جمہوریت کے لیے صوبائی اور قومی اسمبلیاں ضروری ہیں، بلدیاتی ادارے نہیں۔

حیدرآباد

استقلال سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ

صحافت رپورٹ

یکم مئی کو جہاں ملک بھر کے مزدور اپنا دن منا رہے تھے وہاں سندھ بھر سے آنے والے استقلال اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکن حیدرآباد میں جناب محمد سعید کی قیامگاہ پر اپنا کنونشن منعقد کر رہے تھے۔ انتظامیہ نے کنونشن کے باقاعدہ انعقاد، ہال اور لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت نہیں دی، اس لیے بالآخر متعزز جگہ کے بجائے کنونشن کو ہر دور کے معتوب لوگوں کو پناہ دینے والے محمد سعید کے گھر کے دروازے ان کارکنوں کے لیے کھل گئے۔

کنونشن میں مجموعی طور پر شرکا اور مقررین نے نرم نرم انداز میں اور اپنائیت سے بھرپور طریقے سے حکومت کی مخالفت کی حکومت کی مخالفت کرنے اور گرج چمک کے ساتھ تقریر کرنے والوں میں ناہید افضال سرفہرست تھے انہوں نے کہا کہ، جامعہ کراچی میں ایجرہ سے براہ راست ہدایات آتی ہیں تعلیمی اداروں میں مکمل مداخلت ہو رہی ہے، حالات مایوس کن ہیں، لیکن ہم مایوس نہیں۔ ہمارا پختہ یقین ہے کہ انقلاب آئے گا۔ یہ انقلاب مزدوروں طالب علموں اور عورتوں کا انقلاب ہوگا۔

جب ایک شخص زندہ تھا تو کردار کشی کی گئی، پھر مر گیا تو کردار کشی جاری ہے۔ یہ ناانصافی ہے، ظلم ہے، انتخابات فوراً کراؤ۔ ہم آگئے تو آٹا مفت بانٹیں گے۔"

ناہید افضال سے قبل ملک ساجد فروز نے سندھ کے طلبہ کو کنونشن کے انعقاد اور بحالی جمہوریت کا پرچم تھامنے پر مبارکباد دی اور کہا کہ آپ ہماری قیادت کریں۔ استقلال اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر ملک ساجد فروز نے نئے منشور کا اعلان کیا جس کی شرکا نے منظوری دی۔ ان کے علاوہ نواب شاہ کے اصغر مغل، حیدرآباد کے محمود علی قائم خانی، سید مختیار علی اصغری، قاری عبدالرشید اور ٹنڈو آدم کے پرویز شاہین رانا نے خطاب کیا۔

معین خان یوسفی اور صلاح الدین قریشی سیکرٹری جنرل سندھ نے تنظیم کی کارگزاری اور تنظیم نو کے سلسلے میں رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے ایوان کو بتایا کہ استقلال اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے تنظیم کے فروغ کے لیے کیا منصوبہ بندی کی اور گزشتہ سال کے کالج انتخابات میں تنظیم کی مقبولیت کا باعث کیا تھا۔ سندھ کے صدر معین یوسفی نے بتایا کہ تنظیم کس طرح اپنے مقاصد اور نصب العین کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔

انہوں نے اعلان کیا کہ ہم آئندہ عام انتخابات میں ائیر مارشل اصغر خان کے ساتھ کام کریں گے۔

کنونشن تاثر کے لحاظ سے اطمینان بخش رہا، لیکن اجازت نہ ملنے کے باعث رونق میں کمی آ گئی۔

کنونشن کے اختتام پر تقریر کرتے ہوئے مہمان خصوصی جناب اصغر خان نے کہا کہ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ تعلیمی بجٹ کو فوری طور پر دگنا کر دیا جائے، کیونکہ موجودہ بجٹ ناکافی ہے اور ان اخراجات سے تعلیمی میدان میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ آج بھی جہالت ہم پر مسلط ہے، غربت نے ہم کو گھیر رکھا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر غیر ترقیاتی اخراجات کم کر کے تعلیمی مد میں ان اخراجات کو بڑھایا جائے۔ تعلیمی اخراجات ترقیاتی کاموں میں آتے ہیں، جبکہ آج ہم صرف غیر ترقیاتی اخراجات کے طور پر ہزار روپیہ خرچ کر رہے ہیں اور اس پیسہ کا مزا نوکر شاہی لوٹ رہی ہے۔ اس ملک کے عوام کو کیا فائدہ ہوا۔

جناب اصغر خان نے کہا۔ ابھی صرف ہم یہ مطالبے حکومت سے کر سکتے ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ جب ہمیں نظام چلانے کا موقع ملے گا تو ہم یقیناً انقلابی تبدیلیاں لائیں گے، لیکن اس کے ضمن میں ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ لوگ سیاست میں حصہ لیں، کیونکہ سیاست میں حصہ لینے سے آپ کا تعلیمی ماحول تباہ ہوگا۔ آپ صرف اسی حد تک سیاست میں حصہ لیں کہ آپ کی تعلیم پر اثر انداز نہ ہو۔ اگر آپ کے پاس فاضل وقت ہے تو آپ ہمارا ساتھ دیجئے۔ ہمارے امیدوار کا ساتھ دیجئے!! یہ آپ کا ٹھوس کام ہوگا۔ اور نعرے بازی سے بہتر ہوگا۔

فضائیہ کے سابق کمانڈر انچیف نے کہا: آج ہماری آزادی کو ۳۲ سال ہو گئے، لیکن ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ یہ سارا قصور سیاستدانوں کا ہے انہیں شرم نہیں آتی۔ شاید ان کا ذہن ابھی ناپختہ ہے۔ آپ کا ذہن صاف ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن کو پاک اور صاف رکھے، کیونکہ عمر بڑھتی ہے تو لالچ بھی بڑھتا ہے۔ نوجوانوں میں جرأت ہوتی ہے، سچائی ہوتی ہے، ہم بھی یہ طریقہ اپناتے ہیں، اس لیے نوجوان ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم میں منافقت نہیں۔ اگر ہم اپنی منزل سے بھٹکے تو سب سے پہلے نوجوان ہمارے مخالف ہوں گے۔ پاکستان کے قیام کے وقت نوجوانوں نے قوم کا ساتھ دیا تو یہ ملک بنا۔ جس تحریک کا نوجوان ساتھ دیں گے وہ ضرور کامیاب ہوگی۔

اصغر خان نے کہا کہ آپ تازہ ذہن کے ساتھ ملک کے حالات اور اس کی سیاست کا جائزہ لیں۔ حق کے لیے لڑیں، یہ حالات کٹھن تو ہیں، لیکن ناممکن نہیں۔ آپ کی تنظیم نے سندھ میں جو کام کیا اور جو مقام حاصل کیا اس کی مجھے خوشی ہے۔ ہم آپ کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کی بھرپور مدد نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ طلبہ تنظیمیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز خلوص ہے۔ پیسہ کوئی چیز نہیں۔ خلوص سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ ہم آپ کی ہر امداد کے لیے تیار ہیں۔

اصغر خان کی تقریر کے بعد کنونشن کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں کئی مقررین نے خطاب کیا اور اپنے اپنے علاقوں کی تنظیمی کارکردگی کی رپورٹیں پیش کیں۔

آئیے لگے ہاتھوں استقلال سٹوڈنٹس فیڈریشن کے منشور کی چند دفعات کا جائزہ لیں۔

استقلال سٹوڈنٹس فیڈریشن کے منشور کے بقول اس تنظیم کا نصب العین یہ ہے کہ پاکستان کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت اس طرز پر کی جائے کہ وہ جب عملی زندگی میں داخل ہوں اور زمام کار ان کے ہاتھ میں ہو تو وہ صحیح اسلامی معاشرہ قائم کر سکیں۔

منشور کے مطابق اسلام کے مجاہدین کی شکل میں ایک طرف اشتراکیت کے الحاد اور دوسری طرف سرمایہ داری، جاگیرداری کے عذاب سے اس معاشرہ کو نجات دلا سکیں۔ ایسا نظام تعلیم مرتب کرنے میں مدد دے سکیں جو اسلامی اقدار کے عین مطابق ہو۔ جو نو آموز ذہنوں کو محتاج اور اپاہج بنانے کی بجائے ان کی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر اجاگر کرے۔ تعلیمی اداروں کے نظم و نسق میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لا سکیں کہ ان اداروں میں آمریت کی بجائے ان سے وابستہ یا ان پر اثر انداز تمام عناصر کی باہمی مشاورت سے ان کے نظم و نسق کا انتظام کیا جائے۔

منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ استقلال سٹوڈنٹس فیڈریشن مندرجہ ذیل امور پر خصوصی توجہ دے گی:

۱:۔ قومی زبان کو عام تعلیم کا ذریعہ بنانا۔

۲:۔ تنگدست طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے روزگار کا بندوبست۔

۳:۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینا۔

۴:۔ میڈیکل یونیورسٹی کا قیام۔

۵:۔ تعلیم بالغاں کی طرف خصوصی توجہ دینا۔

منشور کے آخر میں مطالبہ کیا گیا ہے ——— کہ ملکی بجٹ کا کم از کم ۲۵ فیصد تعلیم پر صرف کیا جائے۔

سید نذیر گردیزی

پشاور شہر کی صرف ایک نشست پر پانچ سے زائد معروف سیاستدان نبرد آزما ہونگے

انتخابی دنگل کے لیے سیاسی پہلوان اکھاڑے میں آ گئے

خان عبدالقیوم خان نے اپنے پرانے نعرے کا پھر اعادہ کیا اور کہا کہ اصل مسلم لیگ وہی ہے جس میں ان کی ذات بابرکات بحیثیت صدر کے شامل ہے اور یہی قائداعظم کی اصل میراث ہے اور پاکستان کی ماں ہے، نیز پاکستان بھر میں وہ خود واحد منتخب صدر مسلم لیگ ہیں۔ اس "اہم راز" کو انہوں نے اپنے کارکنوں سے صوبہ میں مختلف مقامات پر خطاب کرتے ہوئے بے نقاب کیا۔ انہوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ کبھی سردار عبدالرب نشتر بھی مسلم لیگ کے منتخب صدر ہوا کرتے تھے، لیکن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور اب وہ یعنی خان قیوم حضرت قائداعظم کا قیمتی اثاثہ رہ گئے ہیں اور قائداعظم کے اس بیش بہا اثاثہ کی نمائش اور لوگوں کو اس لاجواب حقیقت سے آشنا کرنے کے لیے بقول ان کے وہ (خان قیوم) ملک کے طول و عرض کے وسیع دورے کر رہے ہیں۔

خان قیوم آج کل جسمانی طور پر بہت معذور ہو چکے ہیں، جب تک دو آدمی سہارا نہ دیں کمزوری اور وزن کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتے۔ جب تک تعارف نہ کرایا جائے پہچان نہیں سکتے، اگرچہ اپنی بینائی کا علاج امریکہ تک سے کروا آئے ہیں، مگر افاقہ نہ ہوا۔ میں نے ایک مسلم لیگی رہنما سے ان کے اس بڑھاپے اور معذوری اور اس پر بے پناہ ہوسِ اقتدار کے بارے میں سوال کیا کہ کیا خان قیوم خان ایسی حالت میں ایک موثر قیادت پیش کر سکتے ہیں، تو محمد یوسف خٹک نے کہا کہ کیا آپ نے انوکی پہلوان سے ان کی کشتی کرانی ہے جبکہ میاں محمد اقبال جو ان کی پارٹی (قیوم لیگ) کے جنرل سیکرٹری اور خان صاحب کے بڑے معتقد ہیں، بولے کہ خان قیوم سے بہتر اور مخلص قیادت آج تک پاکستان کو نصیب نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس صوبہ سرحد کو ہندوستان کا حصہ ہونے سے بچایا، ورنہ آج ہم ہندوستان کے غلام ہوتے۔ سب بڑی بڑی کرسیوں پر ہندو اور سکھ ہوتے اور دربانی ہمارے سپرد ہوتی۔ سب تجارت ان کے ہاتھ میں ہوتی اور مسلمان خوار ہوتے۔ اسلام کا نام لیوا کوئی نہ ہوتا۔ یہ تعلیمی ادارے اور پشاور یونیورسٹی خان قیوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے چھ سال صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا اور اس چھ سال میں صوبہ سرحد نے جتنی ترقی کی وہ ۳۲ سال میں نہ ہو سکی۔ میاں اقبال نے مزید کہا کہ بعد میں جو کچھ بھی ہوا اس کی بنیاد خان قیوم رکھ چکے تھے۔ خان صاحب نہایت پُرخلوص اور سادے انسان ہیں، ہر ایک پر فوراً اعتبار کر لیتے ہیں، ہر ایک سیاستدان پر ان کا احسان ہے۔ یوسف خٹک جو آج کل ان سے علیحدہ ہو گئے ہیں ان کے لیے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنی جیتی ہوئی سیٹ چھوڑی، ورنہ کوہاٹ میں جو یوسف خٹک کا ایک حلقہ ہے وہاں سے خٹک صاحب کامیاب نہ ہو سکے تھے، لیکن خان قیوم نے انہیں اپنی سیٹ دے کر اور مکمل تعاون کر کے کامیاب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مرتبہ خان صاحب حلقہ نمبر ا پشاور سے خود کھڑے ہو رہے ہیں اور یوسف خٹک جنہیں ان کے علاقے میں لوگ مسترد کر چکے ہیں، آج کل چٹھہ گروپ میں شامل ہیں تاکہ حلقہ پشاور کا ٹکٹ حاصل کر سکیں، لیکن خان قیوم کے مقابلے میں ان کی کامیابی مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔ خان قیوم ہی کی وجہ سے یوسف خٹک کو بھٹو صاحب نے وفاقی وزیر لیا تھا، مگر وہ بھی خان قیوم کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

ہم نے پشاور کی معروف شخصیت اور اپنے دور کے نامور کھلاڑی لالہ ایس ایم ایوب سے جب رابطہ قائم کیا، تو انہوں نے کہا کہ وہ پشاور کے حلقہ نمبر ا سے قومی اسمبلی کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر پارٹی نے ٹکٹ دے دیا تو اس دفعہ کامیابی کی فضا بڑی سازگار ہے۔ لالہ صاحب نے کہا کہ ان کا اصل مقابلہ پیپلز پارٹی کے امیدوار سے ہوگا، کیونکہ بقول ان کے مسلم لیگ تو خان قیوم خود اپنے ہاتھوں سے دفنا چکے ہیں۔ باقی جو تھی وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکی ہے اور محدودے چند چٹھہ گروپ اور پگاڑا گروپ میں بھٹکے ہوئے ہیں۔ "وہ زمانہ گیا جب لوگ قیوم خان کی باتوں میں آجاتے تھے، اب تو وہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی طرح اپنی ضمانت بھی نہیں بچا سکے گا"۔

لالہ ایوب نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ خان قیوم کے اس صوبہ پر بہت احسانات ہیں۔ اس کے برعکس خان قیوم نے اس صوبہ کے ساتھ کیا پورے پاکستان کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری اس سے مخالفت ہے، کیونکہ اس بندۂ خدا نے جمہوریت کے نام پردہ بدترین آمریت یہاں قائم کی جس کی نظیر صرف چنگیز اور ہلاکو کے دور میں مل سکتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ خود کو اپنے دورِ استبداد میں خان اعظم کہلواتے تھے۔ یہ وقت تھا جب پاکستان کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں اور قوم کو اصولوں اور اچھائی کا درس دینے کی بجائے خان قیوم جمہوریت کی قبر کھود رہے تھے۔

لالہ ایوب کے بقول کانگریس تو تھی ہی خان قیوم کی مخالف، اس کا ذکر ہی کیا، مگر جو حشر خان قیوم نے مسلم لیگ کا کیا وہ دلچسپ بھی ہے اور ناگفتہ بہ بھی، جب اسمبلی کے ممبر اس کی من مانیوں سے تنگ آئے تو انہوں نے مشورہ کر کے ۲۲ر اپریل ۱۹۴۹ء کو خان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرنے کے لیے خفیہ اجلاس بلایا۔ جلال بابا نے جو اسمبلی کا ممبر اور وزیر بحالیات تھا، مخبری کر کے خان قیوم کو آگاہ کر دیا۔ یہی اپریل کا مہینہ تھا اور اتفاق دیکھیے کہ ۲۰، ۲۲ تاریخ تھی کہ قیوم خان نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر کے ۸ مسلم لیگی رہنماؤں اور چھ اسمبلی کے معزز ممبران، جو پکے مسلم لیگی تھے، کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی اور ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس انضباطی کارروائی کے نتیجہ میں آٹھ مقتدر مسلم لیگی رہنماؤں کو مسلم لیگ سے بیک جنبشِ قلم برطرف کر دیا، ان میں خان محمد ثمین جان خان جو مسلم لیگ صوبہ سرحد کے پہلے صدر رہ چکے تھے، ارباب نور محمد خان اور چھ ایم ایل اے جن میں سردار اسد اللہ جان خان جو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر اور صوبہ سرحد اسمبلی کے حزبِ اختلاف کے لیڈر تھے، نواب قطب الدین خان آف ٹانک جو سرحد اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر تھے، پیر صاحب عبداللطیف (زکوڑی شریف)، سلطان حسن علی آف بوئی اور راجہ سردار خان شامل تھے۔ میاں منظر شاہ ایم ایل اے کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے اطوار درست کر لے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ یہ حضرات اپنا جمہوری حق چاہتے تھے، لیکن انہیں صرف پارٹی سے برطرف نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو ایسے مقدمات میں الجھایا کہ کئی سال تک قید و بند کی صعوبتیں سہتے رہے۔ پیر صاحب زکوڑی شریف، اور پیر صاحب مانکی شریف ان دونوں حضرات نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سرحد میں پاکستان کا قیام انہی حضرات کا مرہون منت تھا، لیکن یہ دونوں پیر صاحبان اپنی خدمات کے بدلے اور پاکستان بنانے کے انعام میں جیل کے شب و روز سے لطف اندوز ہوئے۔

یہ حال تو خود مسلم لیگیوں کا خان قیوم کے ہاتھوں ہوا۔ کانگریس اور دیگر مخالفین کے تو جنازے ہی جیل سے نکلے جن میں قاضی عطاء اللہ سابق وزیر تعلیم اور صدیق جان خان کا نام قابل ذکر ہے۔

حاجی غلام احمد بلور سابق سینیٹر اور این ڈی پی کے ایک ممتاز رہنما ہیں، وہ بھی حلقہ پشاور کے لیے قومی اسمبلی کے لیے امیدوار ہیں، ٹکٹ ملا تو ان کا مقابلہ بھی خان قیوم سے ہوگا، کیونکہ بقول ان کے پیپلز پارٹی کے پاس کارکن کافی ہیں اور اچھے ورکر ہیں، لیکن لیڈر

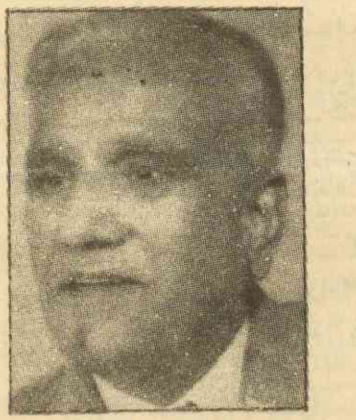

ایس ایم ایوب

شپ نہیں اور شہر کے حلقہ میں پیپلز پارٹی کے کارکن بھی ذاتی تعلقات اور شہری ہونے کی حیثیت سے ووٹ بلور صاحب کو دیں گے، کیونکہ اس حلقہ سے کبھی صحیح طور پر کوئی غیر شہری کامیاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ خان قیوم خود پیر بخش خان، جو شہری تھا، کے مقابلے میں شکست کھا گئے تھے۔ غلام احمد بلور نے کہا کہ خان قیوم کا کوئی مستقبل نہیں، اس لیے اس کے یارِ غار بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں اور اب وہ یوسف بے کارواں ہو کر قریہ قریہ اور گلی گلی کی خاک چھان رہا ہے۔

بلور صاحب نے یہ بھی کہا کہ پہلے پریس پہ پابندی اور لوگوں کی کم علمی کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح خان قیوم کا چھ سالہ دورِ اقتدار پاکستان کے عوام سے چھپا رہا، مگر اب یہ باتیں کھلتی جارہی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۲ر اگست ۱۹۴۸ء کو خان قیوم نے بابڑہ کے مقام پر حریت پسندوں کا جو قتل عام کیا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کافر ہیں اور خان قیوم ان کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ پاکستانی عوام کو اس وقت پریس اور اپنے حواریوں کے ذریعے یہی تاثر دیا گیا کہ یہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں، اس لیے قابل گردن زنی ہیں۔ خیر یہ بات تو حقیقت ہوتے ہوئے بھی پرانی ہو گئی ہے اور سرحد کا نوجوان طبقہ اس پر اتنا زیادہ مشتعل نظر نہیں آتا اور ہو سکتا تھا کہ خان قیوم کی دلربا باتوں میں آ کر پھر اسے ووٹ دے ڈالتا، لیکن ۱۹۷۳ء میں جب قیوم خان مسٹر بھٹو کے وزیر داخلہ تھے تو اس نے لیاقت باغ میں متحدہ محاذ کے جلسہ پر گولیاں چلوائیں اور جب سترہ جنازے سرحد آئے تو یہاں کے لوگوں کو خان قیوم کی سفاکی اور سرحد دشمنی کا پورا علم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں خان قیوم اپنی زرِ ضمانت بھی نہ بچا سکا۔ یعنی سرحد کے عوام نے اسے بالکل مسترد کر دیا۔ اب یہ حضرت کیا منہ لے کر پھر عوام کے سامنے ووٹ مانگنے جاتے ہیں، کیا پھر اہل سرحد نے پھر اپنے بہن بھائیوں کے گھر دل کو اجاڑنا ہے۔

صحیح صورت حال کا تو انتخابات کے نتائج سے پتہ چلے گا، لیکن بظاہر جمیعت العلماء اسلام، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کا چاہے اس کا تینوں میں سے کسی دھڑے سے تعلق ہو، اس حلقے سے انتخاب جیتنا مشکل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اصل مقابلہ پیپلز پارٹی اور این ڈی پی کے مابین ہوگا۔ این ڈی پی اگرچہ اندرونی خلفشار کا شکار ہے، لیکن اس انتشار کے باوجود اس کے پاس قدآور شخصیتوں کی کمی نہیں اور خصوصی طور پر حلقہ نمبر ا یعنی پشاور کے حلقہ میں ان کے پاس اچھے لیڈر موجود ہیں۔

اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ صوبہ سرحد میں دوسری جماعتوں کے پاس اچھے لیڈر نہیں، بااثر امیدوار تو ہر جماعت میں موجود ہیں، لیکن وہ حلقہ جس کا تعلق پشاور شہر اور صدر کے علاقہ سے ہے اس علاقہ میں خان قیوم، یوسف خٹک، لالہ ایس ایم ایوب، حاجی غلام احمد بلور، مولانا امیر محمد عرف بجلی گھر ملا (جمعیت علمائے اسلام)، ڈاکٹر محمد یونس (جماعت اسلامی)، بڑے بڑے امیدوار ہیں اور جمعیت علمائے پاکستان، جمہوری پارٹی، تحریک استقلال، خاکسار وغیرہ یہاں اپنا کوئی نمائندہ یا اس قدر بااثر حلقہ انتخاب نہیں رکھتے، البتہ اگر کسی قسم کا اتحاد ہو تو دوسری بات ہے جس میں بعض اوقات چھوٹی جماعتوں کی بھی لاٹری نکل آتی ہے۔

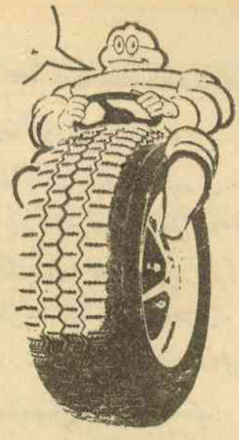

ٹائروں کی غیر ممالک سے بے تحاشا امپورٹ اور اندرون ملک ٹائر ساز کمپنی کے لیے خام مال کی درآمد پر بھاری ڈیوٹی نے اس صنعت کی کمر توڑ دی ہے، حالانکہ اس صنعت کو سنبھالا دیا جائے تو قیمتی زرمبادلہ بچ سکتا ہے

پاکستان کی

ٹائر انڈسٹری کو تباہی سے بچائیے

صحافت رپورٹ

امپورٹ کی کھلی پالیسی پاکستان میں ۱۹۷۲ء میں شروع ہوئی اور اس فراخدلی سے مختلف اشیاء امپورٹ کی جانے لگیں کہ ملکی صنعت کا دیوالیہ نکل گیا۔ اس پالیسی کا مقصد ایک طرف سابقہ حکومت کی طرف سے بعض اداروں اور افراد کو نوازنا تھا جنہیں امپورٹ لائسنس دیے گئے اور دوسری طرف صنعت کاروں کو اس حال تک پہنچانا تھا کہ وہ تنگ آکر خود ہی یہ تمنا کرنے لگیں کہ تمام صنعتی ادارے قومیا لیے جائیں۔ اس طرح حکومت اس ایک کام سے دوہرے فائدے حاصل کر رہی تھی۔ حکومت نے کیا حاصل کیا، اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ ملکی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور زرمبادلہ اس بھاری مقدار میں اڑایا گیا کہ ہماری بیرونِ ملک ادائیگیوں کا توازن خراب اور قرضوں کی مقدار میں اضافہ ہوگیا۔ اس طرح ایک طبقے کو جو حکومت پر قابض تھا یا اُن کے حواریوں پر مشتمل تھا فائدہ پہنچا ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ ملک کو مجموعی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

آج پوزیشن یہ ہے کہ نئی صنعت کاری بند ہے۔ پرانے صنعتی یونٹوں میں سے دو سو سے زائد "بیمار" تصور کیے جاتے ہیں جو بند ہو چکے ہیں یا جزوی طور پر کام کر رہے ہیں۔ ہم ضرورت کی اکثر اشیاء باہر سے منگوا رہے ہیں اور اس کے بدلے میں قیمتی زرمبادلہ گنوا رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جن صنعتی یونٹوں میں کام ہو رہا ہے وہاں بھی پیداوار انتہائی کم ہے اور مال کی کھپت نہیں ہو رہی، کیونکہ اس سے ملتا جلتا مال باہر سے آرہا ہے۔ اکلوتی بندرگاہ، کراچی میں جہاز کھڑے

رہتے ہیں اور مال کو اندرونِ ملک پہنچانے میں حکومت کو خصوصی انتظامات کرنے پڑ رہے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں کے مال کی سپلائی دیکھ کر خریدنے والوں میں غیر ملکی مال حاصل کرنے کی ایک ایسی عادت پیدا ہو گئی ہے کہ ملکی مصنوعات اب اس کی نظر میں حقیر درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک نہ چاہتے ہوئے بھی۔ ملک کا ستیاناس کر رہا ہے اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔

آج عالم یہ ہے کہ امپورٹ کی پالیسیوں میں "فراخدلانہ" رویے نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، بیکری، مکھن، کھانے کی بند چیزیں، سوپ، دودھ اور سوئیاں وغیرہ تک باہر سے امپورٹ ہو رہی ہیں۔ ۱۹۷۶-۷۷ء میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کی جانے والی چیزوں کے مابین فرق ۱۲،۳۱ بلین کا تھا جو اب ۱۹۷۹-۸۰ء میں ۲۴،۴۸ بلین تک پہنچ گیا ہے۔ تمام امپورٹ کی جانے اشیاء میں سے عام استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اوسط ۵۰ فیصد تک پہنچ چکا ہے جسے بآسانی کم کیا جاسکتا ہے کیونکہ نہ تو یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر گزارہ ہو سکے اور نہ انکے متبادل ملک میں ناپید ہیں۔

ملکی صنعت کی طرف اوّل تو گزشتہ دورِ حکومت میں دانستہ توجہ ہی کم دی گئی اور اگر دی گئی تو اس غلط طریقے سے کہ آج قومی پیداوار پہلے سے کم ہے۔ اس وقت کم و بیش ہر صنعتی یونٹ اپنی پیداوار میں کمی کی شکایت کر رہا اور مال کی کھپت میں الگ مشکل درپیش ہے۔ ایک طرف نئے صنعتی یونٹ نہیں لگ رہے، دوسری طرف پہلے سے موجود صنعتی یونٹوں میں کام کم ہو رہا ہے دونوں صورتوں میں بے روزگاری میں اضافہ اور ملکی پیداوار میں کمی کا عمل جاری ہے۔ ملکی محنت کا بیشتر حصہ غیر ممالک کو جانے پر مجبور ہے اور غیر ممالک سے وہ چھوٹی چھوٹی اشیاء جو غیر ضروری ہیں اور جن کے بدل ملک میں موجود ہیں، ملک میں آ رہے ہیں۔

بے تحاشا امپورٹ کے باعث جو ملکی صنعتیں تباہ ہو رہی ہیں ان میں ٹائر اور ٹیوب سازی بھی شامل ہے۔ ملک میں اس وقت ایک بڑا پلانٹ ٹائر سازی کرتا ہے جس کا نام جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی آف پاکستان ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا۔

اس میں جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی اوہیو، امریکہ کے حصص تھے جو دنیا میں اس میدان کی معروف ترین کمپنی ہے۔ آج کل غیر ملکی حصے صرف ۹ فیصد ہیں اور معروف صنعتکار ریٹائرڈ جنرل حبیب اللہ خاں اور ان کے ساتھی اس کمپنی کو چلا رہے ہیں۔ غیر ملکی مشیر اور ماہرین کی خصوصی توجہ اس کمپنی کو حاصل ہے اور اس کا تیار کردہ مال عالمی معیار پر پورا اترتا ہے۔

جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی، پاکستان میں ہر سائز اور ہر قسم کا ٹائر تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، یہ ٹائر گھس جانے کے باوجود ری ٹریٹ کیے جا سکتے ہیں۔ ٹائروں میں بہترین قسم کا خام مال استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں یہ کمپنی ۲ کروڑ روپے کی لاگت سے شروع کی گئی اور آج یہ ۵،۷ کروڑ روپے کی مالیت کے اثاثے رکھتی ہے۔ اس میں موجودہ پلانٹ نہ صرف تھوڑے سے مزید سرمائے سے ملک کی مزید ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے بلکہ اس کی پیداوار کو کسی بھی وقت پچاس فیصد تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ مزید برآں ربڑ کی صنعت ہے جسے لامحدود طریقوں سے پھیلایا جاسکتا ہے اور بے شمار مزید چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔

لیکن یہ امر بدقسمتی کا حامل ہے کہ گزشتہ چند برس سے اس کمپنی کا بجٹ نقصان میں جا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ٹائروں کی بے اندازہ امپورٹ

۲۔ خام مال کی درآمدی قیمت اور ڈیوٹی میں اضافہ

اس کے برعکس کمپنی کے تیار کردہ ٹائروں کی قیمت حکومت کی طرف سے وہی ہے جو تین سال پہلے ۱۹۷۶ء میں مقرر کی گئی تھی، چنانچہ ان عوامل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ:-

۱۔ کمپنی میں پیداوار کم ہو رہی ہے، مثلاً یونٹ اپنی پیداواری صلاحیت کا پچاس سے ساٹھ فیصد تک مال ابتدا ہی میں تیار کر رہا تھا، ۱۹۷۸ء میں یہ تناسب بڑھ کر ۸۳ فیصد ہو گیا، لیکن اسی سال خام مال اور پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافے کے سبب، جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کو ۸۴۳ لاکھ کا فوری نقصان ہوا یاد رہے کہ سنتھیٹک ربڑ اور بعض دوسرے کیمیکل پٹرولیم کی صنعت سے تیار ہوتے ہیں۔ اور جوں جوں پٹرول کی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ٹائر بنانے کے لیے درکار خام مال بھی مہنگا ہوتا جاتا ہے، آیئے ان دونوں عوامل کی تفصیلات کا جائزہ لیں:

خام مال کی قیمتیں

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں گزشتہ پانچ برس میں غیر ملکی خام مال کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ زیادہ تر خام مال پٹرولیم کی صنعت سے آتا ہے اور پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافے پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، ربڑ، سنتھیٹک ربڑ، نائیلون فیبرکس وغیرہ ایسی اشیاء ہیں جن کا تعلق صرف پٹرولیم کی صنعت سے ہے۔

علاوہ ازیں ان اشیاء کی قیمت میں اضافے کی ایک وجہ حکومت پاکستان کی طرف سے غیر ملکی سامان اور خام مال پہ ڈیوٹی کی شرح میں اضافہ بھی ہے۔ چنانچہ اگر کسی خام مال کی قیمت غیر ملکی مارکیٹ میں سو فیصد بڑھی ہے تو اس کی ڈیوٹی میں پاکستان کی حکومت سے پچاس فیصد ضرور اضافہ ہوا ہے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ۱۹۷۶ء کی نسبت آج جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کو دو سے تین گنا مہنگی قیمت پر خام مال خریدنا پڑ رہا ہے۔

قدرتی ربڑ کی قیمت ۱۹۷۶ء میں ۸،۸۸ روپے فی کلو تھی جو مارچ ۷۹ء میں ۲۱،۷۵ روپے فی کلو ہو گئی، اس طرح ۱۳۶ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں سنتھیٹک ربڑ کی قیمت ۶،۳۶ روپے فی کلو تھی جو آج پاکستان میں ۱۵،۲۰ روپے فی کلو پڑ رہی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں کاربن بلیک ۶،۲۹ روپے فی کلو مل رہی تھی جو آج مارچ ۷۹ء میں ۱۲،۲۸ روپے فی کلو ہے۔ نائیلون فیبرکس کی قیمتیں ۵۱،۴۵ سے بڑھ کر ۵۲،۰۷ روپے فی کلو ہو چکی ہیں۔ امپورٹ ڈیوٹی کی شرح

نام اشیاء	جنوری ۷۶ء میں قیمت	مارچ ۷۹ء میں قیمت	قیمت میں اضافہ
سنتھیٹک ربڑ	۵۳,۷۶,۱۵۵ روپے	۷۶,۴۶,۹۹۷ روپے	۲۴,۲۸,۶۸۸ روپے
ہیڈ واٹر	۲۸,۶۹,۵۱۱ روپے	۵۰,۰۵,۵۰۶ روپے	۱۳۴,۰۷۵ روپے
کاربن بلیک	۷۳,۳۵,۱۵۷ روپے	۱۳۳,۶۳,۳۱۳ روپے	۶۰,۲۸,۱۵۶ روپے
نائیلون	۳,۱۲,۳۳,۲۵۵ روپے	۳۵۴,۴۹,۷۷۵ روپے	۴۲,۱۶,۵۲۰ روپے
ٹیوب والو	۱۶,۸۸,۱۵۷ روپے	۲۹,۷۳,۳۵۸ روپے	۳۸۵,۲۲۱ روپے
کل میزان	۵۵۵,۳۵,۴۱۲ روپے	۶۹۹,۴۶,۱۹۸ روپے	۱۴۴,۱۰,۷۸۶ روپے

۱۹۷۶ء میں ۳۵ فیصد تھی جو ۱۹۷۷ء میں ۴۰ فیصد اور ۱۹۷۸ء میں ۶۰ فیصد ہو چکی ہے۔ بیڈ وائر پر ڈیوٹی بھی ۴۰ فیصد سے آج ۷۰ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ کاربن بلیک پر ڈیوٹی بھی ۴۵ فیصد کی بجائے ۶۰ فیصد ہے اور وہ تمام کیمیکل جو اس صنعت میں استعمال ہوتے ہیں ان کی ڈیوٹی ۱۹۷۶ء میں ۲۰ فیصد تھی اور آج ۸۰ فیصد ہے۔

جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کے درج بالا چارٹ پر ایک نظر ڈالیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ۱۹۷۶ء کی نسبت آج کمپنی کو غیر ملکی خام مال پر کس قدر بھاری خرچ برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور مختلف وجوہ کی بناء پر ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔

کمپنی میں نفع کا تناسب اسی اعتبار سے کم ہوا ہے، مثلاً ۱۹۷۶ء میں یہ ۷۷ء۳ فیصد تھا تو آہستہ آہستہ ۱۰۲۹ فیصد رہ گیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ منافع کی شرح میں اس حد تک کمی کے باعث تنخواہوں، فروخت کے اخراجات اور دیگر اخراجات کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں کمپنی کو فائدہ کی بجائے ۸۳ء۰ لاکھ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

یہ سارے اعداد و شمار ملاحظہ کیجیے اور اس ستم ظریفی کا اندازہ لگائیے کہ ۱۹۶۷ء میں حکومت نے ٹائروں کی جو قیمت مقرر کی تھی، آج بھی وہی ہے۔

امپورٹ پالیسی

دوسری بڑی وجہ امپورٹ پالیسی میں فراخدلی ہے اور ٹائروں کی اس وسیع پیمانے پر امپورٹ ہوئی ہے کہ مارکیٹ میں غیر ملکی ٹائروں کا انبار لگ چکا ہے اس رجحان نے ملکی صنعت کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ نئی صنعت لگانے یا پہلے سے موجود صنعت کو چلانے کے لیے سو پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں جبکہ امپورٹ لائسنس حاصل کرنے اور ایل سی کھلوانے کے بعد امپورٹروں کو انگلی تک ہلانا نہیں پڑتی، نہ مزدوروں کا مسئلہ ہے اور نہ ہڑتالوں اور چھٹیوں کا، نہ خام مال کی پریشانی ہے نہ مارکیٹ میں فروخت کی جھک جھک، امپورٹ کرتے وقت اصل قیمتوں میں اضافے ہی سے لاکھوں کروڑوں کما لیے جاتے ہیں۔ ڈیوٹی اور ٹیکس بچانا بھی چنداں مشکل نہیں مختصر یہ کہ جب امپورٹ کے ذریعے آپ ایک روپیہ کما سکتے ہیں تو پھر صنعت میں لگانے سے کیا حاصل۔ یہی وہ رجحان ہے جو ایک طرف ملکی صنعت کا ستیاناس کر رہا ہے، دوسری طرف ملکی معیشت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے، بین الاقوامی ادائیگیاں ہو نہیں سکتیں اور ہم غیر ملکی زرمبادلہ کو امپورٹ کے ذریعے ضائع کرتے جا رہے ہیں، پاکستان تو بنیادی طور پر ترقی پذیر ملک ہے اور یہاں وسائل کی کمی کے باعث زیادہ سے زیادہ ملکی صنعت کو فروغ ملنا چاہیئے، لیکن امریکہ جیسا ملک بھی جہاں روپے کی ریل پیل ہے، سختی سے اپنی امپورٹ لسٹ کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور بلا ضرورت ایک پائی کی چیز بھی امپورٹ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

امپورٹ کرنے والی فرم کو نہ تو لمبا چوڑا سٹاف رکھنا پڑتا ہے اور نہ کارخانے کے لیے جگہ کی تلاش ہوتی ہے۔ اکثر اوقات تو ایک امپورٹر کا دفتر اس کا اپنا بریف کیس ہوتا ہے اور ٹائر امپورٹ کرنے والوں کے بارے میں یہ مثال سو فیصد صادق آتی ہے ایک امپورٹ لائسنس اتنی بار اور اتنی جگہ بکتا ہے کہ اس کی اصل قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی رقموں کے امپورٹ لائسنس فرضی اور جعلی اداروں کے نام پر لئے جاتے ہیں تاکہ انکم ٹیکس کی ادائیگی نہ کرنی پڑے اور ایسی فرمیں کسی جگہ موجود نہیں ہوتیں۔

اس کے برعکس صنعت کے میدان میں نیا یونٹ لگانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ سرمایہ، جگہ، مشین، بجلی یا ایندھن، مستقل ملازموں کی ایک فوج ظفر موج جسے ہر حال میں تنخواہیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ یونٹ بند کرنا پڑے تو الگ مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، مزدور ایک قیامت کھڑی کر دیتے ہیں، سارا سرمایہ جو صنعت میں صرف ہوا ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس وسیع مقدار میں اضافے کے بعد کیا ملکی صنعت کے بچنے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے جبکہ ملکی صنعت میں ٹائر سازی کا واحد کارخانہ مسائل کا شکار ہو، وہاں کام کم ہو رہا ہو، سالانہ بجٹ نقصان میں جا رہا ہو اور خام مال کی قیمتوں میں اضافے مگر ٹائروں کی قیمت میں تسلسل کے باعث بہتری کی کوئی صورت نہ ہو، حالانکہ اگر صحیح منصوبہ بندی اختیار کی جائے تو جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی پاکستان کے کارخانے میں تین گنا پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے، ہفتے میں چھ دن کی بجائے سات دن کام کا شیڈول مرتب کیا جا سکتا ہے۔

اگر پاکستانی کرنسی میں سو کروڑ اور غیر ملکی کرنسی میں ۷۰ کروڑ روپے کی رقم لگائی جائے تو اسی فیکٹری میں موجودہ یونٹ کے مساوی ایک اور یونٹ لگ سکتا ہے جبکہ کمپنی کے پاس دیگر تمام لوازمات، تکنیکی تجربہ، اور ہنر مند موجود ہیں جن کا تعلق براہِ راست امریکی ٹائر ساز ادارے جنرل ٹائر سے ہے۔ جو دنیا میں اس فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ اگر حکومت نئی صنعتوں کا شیڈول بناتے وقت اس میں ٹائر سازی کی صنعت کو بھی شامل کرے گی مگر اس کے لیے نیا یونٹ اور کسی غیر ملکی کمپنی سے بات کی جائے گی تو اس میں نہ صرف وقت سرمایہ اور محنت زیادہ صرف ہو گی، بلکہ یہ مالی اعتبار سے بھی مہنگا سودا ہو گا اور جلد نتائج نہ دے سکے گا۔

ضروری نظر آتا ہے کہ ہم جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی پاکستان کے تین برسوں کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔

سال	پیداوار	فروخت شدہ ٹائر	موجودہ ٹائر
۱۹۷۶ء	۱۴۳،۷۸۵	۱۴۲،۳۵۱	۸۲۹۴
۱۹۷۷ء	۱۵۷،۷۸۰	۱۵۶،۰۰۶	۱۰۰۶۸
۱۹۷۸ء	۱۸۳،۹۹۰	۱،۶۷،۴۲۶	۲۰۶۶۳۲

یہی نہیں بلکہ امپورٹ ہونے والے ٹائروں کی تعداد اور مقدار کا اندازہ کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ اتنی وسیع تعداد ہے کہ حکومت کے لیے اور متعلقہ حکام کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ان کی کوالٹی کی جانچ پڑتال کر سکیں اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر سے کوڑا کچرا اور تیسرے درجے کی مصنوعات یہاں پہنچ رہی ہیں۔

آئیے ایک نظر دیکھیں کہ ۱۹۷۴ء کی نسبت ۱۹۷۸ء میں ٹائروں کی امپورٹ میں کیا اضافہ ہوا۔

۱۹۷۴/۷۵ء	۱۹۷۷/۷۸ء	اضافہ فیصد
۸۵،۲۹۰ سیٹ ٹائر	۱۲۹،۶۶۱ سیٹ ٹائر	۴۲ء۴ فیصد

یہ گوشوارہ ظاہر کرتا ہے کہ ملک میں ٹائروں کی امپورٹ اور ملکی صنعت ٹائر سازی کے مسائل کے باوجود ہر سال جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی نے نہ صرف پیداوار میں تھوڑا بہت اضافہ کیا، بلکہ سیل کے بھی اچھے نتائج پیش کیے، البتہ یہ امر ظاہر ہے کہ اگر امپورٹ پر پابندی لگ جائے، خام مال کی درآمد کو آسان اور ڈیوٹی کو کم کر دیا جائے اور تھوڑی بہت سرمایہ کاری مزید کر دی جائے تو بڑی حد تک ملکی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور انتہائی قیمتی زرمبادلہ بچ سکتا ہے اور حکومت کو ٹیکس اور عوام کو ملکی مگر بہتر اور معیاری مال مل سکتا ہے۔

جعلی اور بوگس فرمیں ۔ ناقص اور ضرورت سے زائد مال ۔ لائسنسوں کی خرید و فروخت

ٹیکس بچانے کے لیے امپورٹروں کی دھاندلیاں

اس امر سے قطع نظر کہ ملک میں جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی جیسی عالمی معیار کے ٹائر تیار کرنے والی فرم کے باوجود، حکومت پاکستان کے پالیسی سازوں نے ٹائروں کی کھلی امپورٹ کی اجازت دے رکھی ہے، خود اس میدان میں بھی ٹائر امپورٹ کرنے والے ایسے ہتھکنڈے اختیار کر رہے ہیں جن سے ملکی خزانے سے عوام کی جیب تک، ہر ایک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اپنے ذاتی فائدے کی خاطر امپورٹ کرنے والے تاجر جو چند ایک ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، ان کا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ عام طور پر امپورٹر حضرات ۹۰ ہزار سے زائد مالیت کا لائسنس نہیں لیتے تاکہ انہیں انکم ٹیکس ادا نہ کرنا پڑے۔

۲۔ اکثر اوقات امپورٹر حضرات مختلف ناموں سے اور مختلف فرموں کے تحت ٹائر امپورٹ کرتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی انکم ٹیکس اور دیگر حکومتی واجبات کو بچانا ہوتا ہے۔

۳۔ اکثر دلال اور غیر قانونی منافع حاصل کرنے کے خواہشمند ایسے ہیں جو امپورٹ لائسنس حاصل کرنے کے لیے جعلی نام کی فرمیں اور جعلی پتے ظاہر کرتے ہیں اور لائسنس حاصل کر کے بازار میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس ناجائز منافع کی شرح آج کل دو فیصد ہے۔ یہ کاروبار ہر لحاظ سے ملکی صنعت ہی نہیں، تجارت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

۴۔ اکثر مستند امپورٹر حضرات بھی بازار سے ایسے ہی جعلی ناموں سے بنے ہوئے لائسنس دو فیصد کے حساب سے خرید لیتے ہیں اور ان پر امپورٹ کرتے ہیں تاکہ ان کی اپنی فرم کو ٹیکس ادا نہ کرنا پڑے۔

۵۔ بعض انڈنٹر حضرات انڈنٹ جاری کرتے وقت مقامی کرنسی میں بھی کمیشن لیتے ہیں، حالانکہ یہ سٹیٹ بنک کی ہدایات کی یکسر خلاف ورزی ہے۔

۶۔ انڈنٹر حضرات کی اکثریت ربڑ کی مصنوعات کے سلسلے میں معیار کی پروا نہیں کرتی۔ انہیں اپنی غیر ملکی صنعتی فرم کا مقرر کردہ ٹارگٹ حاصل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا وہ دھڑا دھڑ غیر معیاری ٹائر جلد گل جانے والا مال بک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج کل کوریا کے بنے ہوئے ناقص ٹائر بڑی تیزی سے پاکستان آ رہے ہیں، حالانکہ عالمی منڈی میں ان کا مال ہر لحاظ سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔

۷۔ انڈنٹر حضرات، امپورٹروں کو دھوکہ بھی دیتے ہیں اور مال کی اصل کیفیت، سائز اور حجم وغیرہ درست انداز میں نہیں بتاتے جس سے بعض اوقات امپورٹ کرنے والوں کا نقصان ہوتا ہے۔ آج کل بھی کیفیت اس قسم کی ہے کہ بعض امپورٹروں کے پاس ایسے ہی مال کی بے تحاشا مقدار جمع ہو گئی ہے اور وہ نہ صرف خود نقصان اٹھاتے ہیں، بلکہ حکومت پاکستان اور اپنے غریب عوام کا محنت سے کمایا ہوا اور قیمتی زرمبادلہ بھی ضائع کر رہی ہے۔

۸۔ بعض پاکستانی امپورٹروں نے کابل میں اپنے دفاتر کھول رکھے ہیں۔ بظاہر وہ افغانستان کے لیے ٹائر امپورٹ کرتے ہیں، لیکن وہ ایسا چکر چلاتے ہیں کہ کراچی بندرگاہ ہی سے یہ ٹائر پاکستانی مارکیٹ میں آ جاتے ہیں۔ یہ طریق کار بھی ہر اعتبار سے پاکستان کے لیے نقصان دہ ہے اور چند لوگ تو ضرور اپنی جھولیاں آسانی سے بھر لیتے ہیں، لیکن ملکی صنعت کے ساتھ ساتھ ملکی تجارت کا خانہ خراب ہو رہا ہے۔

یہ عوامل ایسے نہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکے، اگر ملکی صنعت کو بچانا اور تجارت کو صحیح خطوط پر چلانا ہے تو ان کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

صرف چند اقدامات کی ضرورت ہے، ملکی صنعت پھلے پھولے گی، بیروزگاری دور ہوگی اور غیر ملکی زرمبادلہ بچے گا۔

ہم ٹائر سازی میں خود کفیل ہو سکتے ہیں

کیا پاکستان ٹائر سازی میں خود کفیل ہو سکتا ہے؟ اس کا انحصار پاکستان کی واحد ٹائر سازی کی صنعت، جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کی استعداد پر ہے۔

جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کی سالانہ پیداوار آج کل ۲،۲۰،۰۰۰ سیٹ ٹائر ہے اور اس میں اضافہ اس توسیعی پلان کے تحت ہو سکتا ہے جس کی تکمیل سے ۳،۶۰،۰۰۰ سیٹ ٹائر سالانہ تیار ہوں گے۔ یہ توسیعی پلان پاک اک کے پاس منظوری کے لیے پڑا ہے۔

ایک طرف ٹائر باہر سے منگوائے جا رہے ہیں، دوسری طرف ملکی ٹائر ساز کمپنی کو دو بڑے مسائل درپیش ہیں:

الف۔ غیر ملکی ٹائروں کی بھرمار کے باعث ملکی صنعت کی حوصلہ شکنی۔

ب۔ غیر ممالک سے منگوائے جانے والے خام مال پر درآمدی ڈیوٹی میں اضافہ۔

اگر یہ دونوں مسائل حل کر دیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ملکی ٹائر سازی کی صنعت ترقی نہ کر سکے اور قیمتی زرمبادلہ بچایا نہ جا سکے۔

یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کی مصنوعات نہ صرف عالمی معیار کے حساب سے اعلیٰ ہیں، بلکہ یہ کمپنی حکومت پاکستان کو سب سے زیادہ

ٹیکس ادا کرنے والی کمپنیوں میں سے ایک ہے، لیکن ۱۹۷۶ء سے جبکہ ٹائروں کی امپورٹ کھولی گئی، کمپنی کو نہ صرف مختلف مسائل درپیش ہیں بلکہ ۱۹۷۸ء تک پہنچتے پہنچتے اسے سالانہ ۳۰ لاکھ کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرے تو ٹائر سازی کی صنعت پھل پھول سکتی ہے اور زرمبادلہ بچا کر ملک میں بے روزگاری اور افراطِ زر کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ٹائروں کی امپورٹ پر پابندی عائد کر کے اسے TIED LIST میں رکھا جائے یا اس کی امپورٹ کو ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے سپرد کیا جائے تاکہ وہی ٹائر منگوائے جا سکیں جو ملک میں نہیں بن رہے یا کم بن رہے ہیں۔ ہر قسم کے ٹائر منگوانے پر سختی سے پابندی عائد کی جائے۔

۲۔ ٹائروں کی امپورٹ پر کسٹم ڈیوٹی بڑھا دی جائے اور اسے ۸۵ فیصد سے ۱۱۵ فیصد کیا جائے تاکہ غیر ملکی سامان کی حوصلہ شکنی ہو اور ملکی مال کی قیمتیں نسبتاً کم ہونے کے باعث اس کی فروخت میں اضافہ ہو۔

۳۔ اگر ٹائروں کی امپورٹ کو اسی طرح فری لسٹ پر رکھنا بہتر ہو تو سالانہ ایک خاص تعداد تک اسے محدود کیا جائے تاکہ بے پناہ اور بے اندازہ امپورٹ کو روکا جا سکے۔ یہ پابندی ملکی صنعت کی پیداوار کو مدنظر رکھ کر لگائی جائے۔

ان تراکیب سے ملکی صنعت کو فروغ ملے گا اور اگر ہمیں زرمبادلہ صرف کرنا ہی ہے تو کیوں نہ اسے پہلے سے موجود پلانٹ میں توسیع کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر غیر ملکی مال پر ڈیوٹی کم کر دی جائے تو ملکی مصنوعات کو فروغ دینے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ اگر ان خطوط پر کام کیا جائے تو حسبِ ذیل فوائد ہوں گے:

۱۔ ملکی صنعت کو فروغ ملنے سے بے روزگاری میں کمی ہوگی۔

۲۔ امپورٹروں کی طرف سے ڈیوٹی بچانے کا رجحان ختم ہوگا اور صنعتیں حکومت کو اپنے واجبات ادا کریں گی۔

۳۔ غیر ملکی زرمبادلہ بچے گا۔

۴۔ ملکی مصنوعات پر کوالٹی کنٹرول ممکن ہو سکے گا۔

۵۔ طلب اور رسد کے اصول کے مطابق اتنا ہی مال بنے گا جتنا کہ ضرورت ہوگی۔ امپورٹ لائسنس لے کر منافع پر بیچنے کے رجحان کے تحت ہر قسم کے مال کے ذخائر جمع ہو کر ملکی معیشت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کا قلع قمع ممکن ہو سکے گا۔ ◻◻

نئی صنعتوں کے قیام کے لیے حکومت پاکستان نے جو شیڈول تیار کیا ہے اس میں ربڑ اور ٹائر سازی کی صنعت بھی شامل ہے جبکہ ٹائر سازی کا سب سے بڑا کارخانہ غیر ملکی ٹائروں کی کھلی امپورٹ اور دیگر غلط سرکاری پالیسیوں کے باعث تباہ ہو رہا ہے۔

پہلے بیمار صنعتوں کی خبر لیجیے

حکومت پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ ۳۹ بلین کے سرمائے سے نئی صنعتیں قائم کی جائیں گی جو سولہ بڑے گروپوں پر مبنی ہوں گی۔ ان میں سیمنٹ، فرٹیلائزر، تمباکو، کھانے پینے کی چیزیں، ٹیکسٹائل، چینی، ربڑ اور ربڑ کی مصنوعات تیار کرنے والی صنعتیں شامل ہوں گی۔ ان صنعتوں کے لیے سرمایہ کاروں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان میں روپیہ لگائیں۔

کون ہے جو ملک میں نئی صنعتوں کے قیام کی مخالفت کرے گا، لیکن ذرا ایک لمحے کے لیے رکیے اور سوچیے کہ نئی صنعتیں قائم کرنے کا شیڈول دینے سے پہلے کیا ملک میں موجود صنعتوں کی حالت کا جائزہ لینا ضروری نہیں اور اگر نئی صنعتیں اپنے قیام کے فوراً بعد اسی قسم کے مسائل کا شکار ہو جائیں جس قسم کے مسائل پہلے سے موجود صنعتوں کو درپیش ہیں تو بہتر یہی ہوگا کہ پہلے ان مسائل کا جائزہ لیا جائے تاکہ نئی سرمایہ کاری ضائع نہ ہو۔

نئے صنعتی شیڈول میں ربڑ اور ربڑ کی صنعتوں کا بھی ذکر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ربڑ اور ربڑ کی صنعتوں کو نئے شیڈول میں شامل کیوں کیا گیا جبکہ ملک میں ربڑ اور ربڑ کی صنعت پر مشتمل کئی کارخانے بالخصوص ربڑ ٹائر تیار کرنے والی دو بڑی فیکٹریاں حالات کی ستم ظریفی اور ناسازگاری کا شکار ہو کر بند ہو چکی ہیں اور ایک فیکٹری جس کا نام جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی ہے، بمشکل اپنے آپ کو چلا رہی ہے اور حالات کی عدم موافقت کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہی ہے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی ملک میں اپنی قسم کا سب سے بڑا صنعتی یونٹ ہے اور یہاں کاروں، ٹرکوں، بسوں، جیپوں اور ٹریکٹروں کے لئے معیاری ٹائر تیار کئے جاتے ہیں۔

یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی صنعتی فرم بھی ہے۔ اس صنعتی یونٹ کی بنیادی سرمایہ کاری ۵ کروڑ روپے پر مشتمل تھی اور اتنی عظیم لاگت سے تیار کردہ فیکٹری آج شدید ترین مشکلات سے دوچار ہے۔

ہمارے ہاں سرمایہ کاروں کو اکثر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ نئے صنعتی یونٹ نہیں لگاتے اور اپنا سرمایہ غیر صنعتی کاموں پر صرف کرتے ہیں۔ آج نئی صنعتوں کا شیڈول دیکھ کر یقیناً مسرت ہوتی ہے کہ حکومت اس طرف توجہ دے رہی ہے، تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن بھی مقرر کرے جو پہلے سے موجود کم و بیش دو سو بیمار صنعتی یونٹوں کا جائزہ لے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور بند پڑے ہیں یا جہاں معمولی اور جزوی کام ہو رہا ہے۔

بیمار صنعتی یونٹوں کا مسئلہ طے کیے بغیر اور ان عوامل کا کھوج لگائے بنا جو ان کے راستے میں رکاوٹ بنے، نئی صنعتوں کے لیے سرمایہ کاری کی منظوری دینا لاحاصل کام ہے۔ مثال کے طور پر ربڑ کی صنعت ہی کو لیں اور دیکھیں کہ اس کی موجودہ مشکلات کیوں پیدا ہوئیں اور ان کی پشت پر کون سے خفیہ ہاتھ کام کر رہے ہیں۔

ملک میں موجود ٹائر سازی کی صنعت کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے بھاری مقدار میں ٹائر منگوائے جا رہے ہیں اور گزشتہ چار برس میں تو ان ٹائروں کی امپورٹ میں خوفناک اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۷۴-۷۵ سے ٹائروں کی امپورٹ میں ۱۵۵ فیصد سے ۷۷۰ فیصد تک اضافہ ہوا اور ایسے ملک میں جہاں اس قدر تیزی سے بیرونی مال کی درآمد جاری ہو اور اس کھلے دل سے کھلی امپورٹ پالیسیاں بنائی جائیں، وہاں ملکی مصنوعات کیوں کر پنپ سکتی ہیں اور پہلے سے موجود صنعتی یونٹ تباہی سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

یہی نہیں بلکہ ماضی میں امپورٹ پر پابندی یا اس کی اجازت کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ جب کسی

طبقے یا گروہ کے حق میں پابندی کو مفید جانا یہ پابندی لگا دی گئی اور جب حالات اس کے برعکس دیکھے تو تمام پابندیاں نرم کر دی گئیں۔

ٹائر انڈسٹری کو کھلی امپورٹ کے علاوہ بھی کئی دیگر مسائل درپیش ہیں، مثال کے طور پر پاکستان میں ٹائر سازی کے لیے جو خام مال استعمال ہوتا ہے وہ بیرونی ممالک سے امپورٹ کیا جاتا ہے۔ قدرتی ربڑ، سینتھٹک ربڑ اور کاربن بلیک بنیادی چیزیں ہیں جو ٹائر سازی کے لیے باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور پٹرولیم کی مصنوعات میں عالمی سطح پر جو اضافہ ہوا اس کے باعث ان چیزوں کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ صرف ایک مثال سے یہ فرق محسوس کیا جا سکتا ہے، پاکستان کے سب سے بڑے ٹائر ساز ادارے جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کو جنوری ۱۹۷۶ء میں خام مال منگوانے پر جو رقم خرچ کرنا پڑتی تھی اسی مقدار کے لیے مارچ ۱۹۷۹ء میں ۲۶۰ فی صد زائد ادا کرنا پڑتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ باہر سے درآمد کے لیے خام مال پر ڈیوٹی اور دیگر محصولات میں بھی سال بہ سال حکومت پاکستان کی طرف سے اضافہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو ٹائر سازی میں استعمال کے لیے باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور جن کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے مجموعی طور پر ۱۹۷۶ء سے اب تک ٹائر سازی کے لیے منگوائے جانے والے خام مال کی قیمتیں دو سے تین گنا تک بڑھ گئی ہیں۔

اس پر ستم یہ کہ حکومت پاکستان نے جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کے ٹائروں کی جو قیمت ۱۹۷۶ء میں مقرر کی تھی وہ اسی تک چلی آ رہی ہے دوسری طرف امپورٹ کیے جانے والے غیر ملکی ٹائروں کی قیمت پر کوئی کنٹرول نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حکومت پاکستان کے پالیسی ساز یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک پیداوار کی لاگت اور خام مال کی قیمتوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا نئی صنعتوں کے شیڈول میں ربڑ اور ربڑ کی مصنوعات بھی شامل کی گئی ہیں اور اگر جنرل ٹائر اینڈ ربڑ کمپنی کی طرح اس میدان میں کوئی صنعت لگائی گئی تو اس پر کم و بیش ایک سو کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

کیا یہ زیادہ مفید نہیں ہوگا کہ نئی ٹائر سازی کی کمپنیاں بنانے کی بجائے پہلے سے موجود کمپنی کی حالت سدھاری جائے اس میں توسیع کی جائے، اس پر مزید سرمایہ لگایا جائے اور خام مال کی درآمد سے لے کر ٹائروں کی امپورٹ کی غلطی تک ہر مرحلے پر وہ تمام نقائص دور کیے جائیں جن کے باعث ٹائر سازی کی ملکی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ نئی صنعتوں کے لیے سرمایہ کاری طلب کرنے سے قبل ضروری ہے کہ حکومت پہلے سے موجود صنعتی یونٹوں کے مسائل حل کرے اور جب تک مختلف صنعتی یونٹوں کو درپیش مسائل کا کھوج لگا کر انہیں دور نہ کیا جائے نئی سرمایہ کاری لا حاصل ہو گی اور ملکی معیشت کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہو گی۔

جائزہ

گزشتہ حکومت کے دور میں سب سے زیادہ نقصان صنعت کو پہنچا

پیپلز پارٹی کی جاگیردار قیادت صنعت کاروں کی دشمن اوّل تھی

محمد شبیر

قارئین کرام، آپ نے ٹائر انڈسٹری کے بارے میں مضامین پڑھے۔ یہ صرف ایک صنعت کا مسئلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چھ برسوں میں مزدوروں کی حمایت کی آڑ میں صنعت کا ستیاناس کیا تھا اور پیپلز پارٹی کے تمام بڑے لیڈر جو بنیادی طور پر جاگیردار تھے، نے صنعت کاروں کو جو ایوب خان کے دور میں سامنے آئے تھے، بائیس خاندانوں کے نام پر چن چن کر کچلنے کی کوشش کی، ملکی صنعت میں اس قدر منافع نہ تھا جتنا امپورٹ کے کاروبار میں جہاں صرف ایک جنبش قلم سے کسی بھی شخص کو فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا، لہذا پیپلز پارٹی کی حکومت نے امپورٹ کو فروغ دیا اور ملکی صنعت کے لیے تباہ کن پالیسیاں بنائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صنعت کاروں پر حکومتی دباؤ ڈال کر محنت کشوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنا کسی بھی منتخب حکومت کے لیے ضروری ہے، لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ دباؤ اتنا ہی ڈالا جائے جتنا برداشت ہو سکے، یہ نہ ہو کہ صنعت ہی ختم ہو جائے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ صنعت کو پھلنا اور پھولنا چاہیے، پیداوار بڑھے گی، منافع زیادہ ہو گا تو مزدوروں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں زبردستی ان صنعت کاروں سے دلائی جا سکیں گی، لیکن بیمار یا مقفل کارخانے سوائے بیروزگاری بڑھانے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔

ووٹ حاصل کرنے اور عوام کی ایک بڑی تعداد کو خوش کرنے کے لیے صرف صنعت کار کو گالی دینے سے شاید وقتی فوائد تو حاصل ہو سکیں، لیکن ملک کو نقصان ہو گا۔ پھر بڑے صنعت کاروں کو چھوڑیئے، کیا چھوٹے درجے کا یا درمیانہ صنعت کار بھی قارون کا خزانہ رکھتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ چھوٹے صنعت کار بنیادی طور پر خود بھی ورکر ہوتے ہیں جو رشتہ داروں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے یونٹ لگاتے ہیں، لیکن ایک طرف محنت کشوں کو انہیں ذلیل کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی، دوسری طرف محنت کشوں سے پیداوار بڑھانے کے لیے کوئی تحریک نہ چلائی گئی، حکومتی پالیسیاں ایسی تھیں کہ صنعت لگانے سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار زیادہ منفعت بخش تھا یا پھر زمین خرید کر مکان بنانا یا شاپنگ پلازا تیار کرنا آسان اور نفع بخش نظر آیا۔ چنانچہ بڑے بڑے کارخانہ دار بھی اس طرف متوجہ ہو گئے اور صنعتیں ٹھپ ہو گئیں۔

آج عالم یہ ہے کہ ملک میں دو سو سے زائد بیمار صنعتی یونٹ موجود ہیں اور ملکی مزدور کام نہ ملنے یا معاوضہ کم ملنے کی وجہ سے پاکستان سے باہر تیزی سے جا رہا ہے۔ خدا کے لیے صرف نعرے بازی کی رو میں نہ بہیے اور حقائق کا سامنا کر کے درست پالیسیاں بنائیے۔ مزدور اور محنت کش کو بھرپور معاوضہ دلوایئے، لیکن صنعت کو تباہ کروانے سے ایسا نہیں ہوگا، اسے چلانے اور سہولتیں دینے سے یہ کام ممکن ہو سکے گا۔

س سال تقریباً ۳۵ لاکھ افراد
پی آئی اے سے سفر کریں گے۔

یہ تعداد گزشتہ سال کے مقابلے میں ۲۶ فیصد زیادہ ہے۔ فی الحقیقت مسافروں کے روزافزوں تعاون ہی کی بدولت آج پی آئی اے کا شمار دنیا کی کامیاب ترین ہوائی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنے کرم فرماؤں کی توقعات پر پورا اُترنے اور خدمت کے ہر شعبے کو بہتر بنانے کے لئے مسلسل کوشاں ہیں۔ مسافروں کو بلاتاخیر بکنگ اور فوری ریزرویشن فراہم کرنے کی غرض سے لاہور اور کراچی میں نئے بکنگ آفس زیرِ تعمیر ہیں۔ نیز ریزرویشن کے طریق کار کو سہل اور آسان بنانے کے لئے کمپیوٹر سسٹم سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔

ایئر پورٹ پر مسافروں کی سہولت کے پیشِ نظر کمپیوٹرائزڈ چیک اِن سسٹم کے قیام، جدید گراؤنڈ ہینڈلنگ ایکوپمنٹ کی فراہمی اور بڑی ٹیب ڈمینل جیسے کروڑوں روپے کے منصوبے تکمیل کے

مختلف مراحل میں ہیں۔ علاوہ ازیں ایئرپورٹ کی موجودہ عمارت میں توسیع کی گئی ہے۔ اور خدمت کا معیار بھی بہتر ہوا ہے۔

ایک بکٹ کی تیاری میں اب اوسطاً ۵۰۔۶۰ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ یہ اوسط مقرر کردہ بین الاقوامی معیار کے عین مطابق ہے۔

ایئرپورٹ پر بھی ہماری کارکردگی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ سامان کی گمشدگی کے تناسب میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر نومبر ۸۰ء میں ۲۷،۵۳۳۲ مسافروں نے پی آئی اے سے سفر کیا ان میں سے ہر دس ہزار مسافروں پر سامان کی گمشدگی کی اوسط ۲ رہی جبکہ بین الاقوامی معیار کے حساب سے ہر دس ہزار مسافروں پر کلیم کی اوسط ۵ ہے۔

آپ کے تعاون سے پی آئی اے خدمت کے ہر شعبے کو بہتر بنانے کے لئے مسلسل کوشاں ہے۔

PIA
پی آئی اے
ستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ - لاجواب پرواز

IAL IPP-

ہفت روزہ صحافت ○ ۳۸۔ملتان روڈ۔ لاہور ○ رجسٹرڈ ایل نمبر: ۸۱۰۳
فون نمبر : ۶۱۶۰۷۸

نئی نسل کو کیا مِلا ؟

نفرت ، مایوسی اور منافقت ، بھوک ، بیروزگاری اور تاریک مستقبل

- پاکستان آج جن مسائل کا شکار ہے کیا ان کے ذمہ دار سیاسی میدان پر قابض پیشہ ور اور بدنام زمانہ بوڑھے جاگیردار، ریٹائرڈ جرنیل اور مفاد پرست مُلّا نہیں جنہوں نے گذشتہ ۳۲ برس سے اپنی گندی سیاست اور ذاتی اغراض کی وجہ سے :
- پاکستان توڑا۔
- غریب کو غریب تر کیا۔
- عدل و انصاف کے بجائے ظلم و بے انصافی کو فروغ دیا۔
- صوبے کو صوبے اور علاقے کو علاقے سے لڑایا۔
- عوام کے مختلف طبقوں میں اختلاف رائے کو جانی دشمنی کی شکل دی۔
- صنعت و تجارت اور زراعت کو تباہ کیا اور طبقاتی نفرت کو تیز تر کیا۔ قوم کو غیر ملکی سامان کا عادی بنایا اور ملک کو بڑی طاقتوں کے ہاتھ رہن رکھ دیا۔

کیا یہ درست نہیں کہ آج پاکستان آتشگیر مادے کا ایسا ڈھیر بن گیا ہے جو کسی بھی وقت آگ پکڑ سکتا ہے اور ملکی امن و سکون

بھک سے اڑ سکتا ہے، پھر نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہوں، کتنے گھر برباد ہوں، کتنے بچے یتیم اور کتنی عورتیں بیوہ ہوں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار کوئی ایک گروہ یا ایک جماعت نہیں بلکہ ۳۲ سال سے سیاست پر چھائے ہوئے سبھی گروہ اور سبھی جماعتیں ہیں۔ خواہ ان کا تعلق بظاہر دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے، اندر سے سبھی منافق، سبھی خودغرض اور سبھی عوام دشمن ہیں۔

ملک کو ان مکروہ چہروں اور بوڑھی گدھوں سے بچائیے

نوجوان طبقے سے تعلیم یافتہ، روشن دماغ، ترقی پسند اور اچھے کردار کے حامل نوجوانوں کو سیاست، معیشت، تجارت، صنعت اور دفتر و کاروبار میں آگے لانے ہی سے ملک مضبوط، مستقبل روشن اور عوام کے مابین اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔

نوجوانِ پاکستان

پاکستانی نوجوانوں کی ایسی تنظیم ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لئے کام کا آغاز کر رہی ہے۔ آپ جہاں کہیں ہیں،
ہمیں اپنے مشوروں سے نوازیئے، ہم سے رابطہ قائم کیجیئے۔